مثالی

حافظ عبدالرزاق (ایم اے)

ادارہ نقشبندیہ اویسیہ دارالعرفان منارہ، ضلع چکوال

مغالطے

تالیف

حافظ عبدالرزاق ایم۔ اے

ناشر

ادارہ نقشبندیہ اویسیہ دارالعرفان (منارہ) ڈسٹرکٹ چکوال

مغالطے

نوعِ انسانی کی فکری سعی و کاوش اور اس کے علوم و تحقیقات کی سرگزشت جتنی کہ منصۂ شہود پر آئی جا رہی ہے۔ اور جس قدر اس کی تفصیلات پردۂ خفا سے باہر آ رہی ہیں اس بات کا یقین بڑھتا جا رہا ہے کہ انسان اپنی فکر و دانش کے ابتدائی مراحل سے لے کر بظاہر اس کی تکمیل کے موجودہ مقامات تک ہر سطح پر کچھ فکری لغزشوں یا مغالطوں کا شکار رہا ہے۔

یہ مغالطے کیوں ہیں اور لغزشِ فکر کے ان مقامات کی اصل توجیہ کیا ہے۔ کیا یہ کج بینی و کج رائی کے مظاہر ہیں یا کوتاہ نظری اور سوئے فہم کے نتائج! تعصب و جہالت کی کرشمہ سازیاں یا خود پسندی یا خود رائی کی سحر طرازیاں۔

حقائقِ اشیاء سے کما حقہٗ واقف نہ ہو سکنا بھی بسا اوقات مغالطے کا سبب ہو سکتا ہے اور نگاہِ تعصب بھی رائی کا پہاڑ بنا سکتی ہے وہم حقیقت بن کر ذہن پر چھا جاتا ہے۔ اور حقیقت آنکھوں سے ایسی اوجھل ہوتی ہے کہ کوئی روشنی اس کے خد و خال کو واضح نہیں کر پاتی۔

یہ مغالطے حوصلہ شکن بھی ہیں اور حوصلہ افزا بھی۔ ٹھوکروں اور لغزشوں کے دامن سے ہی راستہ نکلتا ہے۔ اور انہی الجھنوں کے سلجھ جانے سے حقیقت کا چہرہ بے غبار ہو جاتا ہے۔ اسی فکری کشاکش سے طلب و جستجو کی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ اور بسا اوقات کسی ٹھوکر سے ایسا شعور ابھرتا ہے کہ آپ سے آپ بہت سی مشکلیں آسان اور ہزاروں گتھیاں سلجھ جاتی ہیں۔

مغالطوں میں الجھنا اور پھر ان سے نکلنے کی کوشش کرنا انسان کی افتادِ مزاج اور اس کی

محدود دماغ صرف عقل نارسا! کہ جسے غلط فہمی ہے وہ عقلِ کل، دانشِ کمال، ذہینِ حقیقت سمجھتا ہے، اِس طرح اپنی استعداد کے تفاوت سے حقائق کی مختلف تعبیرات تک جا پہنچتا ہے۔ اور ہر تعبیر کو تعبیرِ حقیقی مان لینے اور منوانے کے مغالطے میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

دینِ حق ـــــ اسلام میں کسی طرح کا کوئی مغالطہ یا اُلجھن نہیں ـــ لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ، یہ دانشِ حقیقی وہ صراطِ مستقیم ہے جہاں کوئی ٹھوکر نہیں۔ منزلوں کہیں ظلمت و التباس کا نشان نہیں۔ وہم کا گزر نہیں۔ عقل کی ٹھوکریں اور جہلِ خرد کا کوئی مغالطہ نہیں ـــــ "آیاتِ بینات" اور "کتابِ مبین" سے واضح اور کون سی حقیقت ہوگی۔ وحئِ الٰہی سے بڑھ کر کون سی روشنی ہے اور اسوۂ حسنہ نبویہ علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والتحیہ کے علاوہ رشد و ہدایت کی کونسی راہ ہے کہ لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ ـــــ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ روشنی نورٌ علیٰ نور ہے۔

دینی حقائق و معارف اور مسائل کی تعبیر و توضیح میں بھی انسان کی عقلِ محدود ہر دور میں ایسی ایسی بحوبہ طرازیوں کا شکار ہوتی ہے کہ ایسے مغالطوں کی ایک تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے ـــــ علمائے محققین کی رائے میں اس کی بنیاد محض غلط فہمی یا سادگی نہیں بلکہ اس میدان میں اکثر مقامات پر حبِ جاہ، اتباعِ ہوی اور ناقص علم کی کرشمہ طرازیوں پر ہے۔ علمائے ربانی ہر دور میں یہ خدمت انجام دیتے چلے آئے ہیں۔ مغالطوں اور فکری لغزشوں سے اُمتِ مسلمہ کے اُلجھے ہوئے دامن کو چھڑاتے رہے ہیں۔

"مغالطے" نام کی یہ مختصر سی تحریر حضرت حافظ عبدالرزاق صاحب مدظلہ العالی کے رشحاتِ قلم کا فیضان ہے۔ اسلوبِ بیان اور اندازِ تفہیم ہر ہر مرحلہ پر قاری کے سامنے

حقائق کی ایک نئی دنیا کھول دیتا ہے ، اور قلب و نظر میں ایک ایسی وسعت پیدا ہو جاتی ہے جس سے یہ احساس ابھرتا ہے کہ اب تک ہم کس مغالطے میں تھے ۔ اور حقیقت کتنی سادہ، دلنشین، عام فہم اور واضح تھی۔

موضوعات کا تنوع عبادات و عقائد سے لے کر معاملات، فکر و جذبہ کی جولانگاہوں تک پھیلا ہوا ہے۔ اختصار اور جامعیت اس تحریر کی جان ہے۔

دل نشینی و دل گدازی اس کی روح !

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ

بحرمۃ سید المرسلین وآلہ واصحابہ وازواجہ اجمعین

نمازِ پنجگانہ

نماز:

۱۔سوال۔ظہر، مغرب اور عشاء کے نوافل کا بہشتی زیور میں کوئی ذکر نہیں اور ویسے بھی یہ ضروری نہیں، کیا وجہ ہے کہ ہمارے ملک میں تقریباً سب ہی لوگ انھیں بڑے اہتمام سے پڑھتے ہیں، ان کی ابتدا کیا ہے اگر کسی بچے کو یا نئی نسل کو صرف فرض اور سنت کی ترغیب دی جائے تو ہو سکتا ہے وہ آسانی سے نماز کی جانب مائل ہوں۔

جواب: نفل کے معنی ہیں زائد، اور ظاہر ہے کہ زائد وہی ہوتا ہے جو ضروری نہ ہو تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس سے غرض کیا ہے؟ تجربہ اور مشاہدہ سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ زائد کا مقصد یا تو اصل کی تکمیل یا استحکام یا آرائش ہوتا ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ کیا ہر معاملے میں انسان ضروری پر مطمئن ہو جاتا ہے یا تکمیل و تزئین و استحکام کے لیے اہتمام کرنے کا طبیعت تقاضا کرتی ہے مثال کے طور پر لباس کو لیجیے تین۳ یا دو۲ سادہ کپڑوں سے ضرورت پوری ہو سکتی ہے۔ مگر کیا انسان اس پر اکتفا کرتا ہے۔ مشاہدہ اس کے برعکس یہ ہے کہ اول تو لباس بناوٹ اور تراش خراش میں "نوافل" کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ خوب اکڑے ہوئے کالر ہوں سامنے دو۲ جیب ہوں ان پر فلیپ ہوں، زپ ہوں، بٹن ہوں کاج ہوں گریباں کے آس پاس کشیدہ کاری ہو، کف لنک ہوں۔ آستین کے سرے پر تین تین بٹن ہوں۔

پھر کپڑوں کی تعداد دیکھیے۔ سردیوں میں بنیان سویٹر غیر ضروری ٹھیرے مگر گرمیوں میں اچکن لٹکا رکھی ہے گلے تک بٹن بند ہیں۔ یا سوٹ زیب تن کر رکھا ہے۔ اس کی آخر کیا ضرورت ہے، غرض لباس میں جتنے فیشن نظر آتے ہیں ان میں کتنا حصہ ضروری اور کس قدر زائد ہے اور جو زائد ہے وہ کیوں ہے اور اس کا اہتمام کیوں ہے۔

مکان کو لیجیے، سر چھپانے کے لئے انسان کی بنیادی ضرورت ہے، یہ ضرورت یوں پوری ہو سکتی ہے کہ دیواریں اٹھائیں چھت ڈالی، دروازے کھڑکیاں لگائیں ضرورت پوری ہو گئی۔ مگر یہ ٹیپ، پلستر۔ ڈسٹمپر چپس، چوبی حصے پر رنگ روغن یہ پردے سامان آرائش چھت دکھو تو لٹل اس پر پولیتھن پھر تارکول پھر مٹی، پھر فرش یہ سب کچھ ضرورت سے زائد ہے۔ مگر انسان ان "نوافل" کا کتنا حریص نظر آتا ہے۔

خوراک کو لیجیے دو روٹیاں اور ایک چمچ سالن پیٹ بھرنے کے لئے کافی ہے مگر یہ متنجن، بریانی، شامی کباب، چٹنی، سلاد، فروٹ، سویٹ، ڈش، یہ سب "نوافل" ہی تو ہیں مگر کتنے دل کش اور کیسے مرغوب۔

ان تین بنیادی ضرورتوں کے علاوہ جسمانی صفائی اور نظامت بھی انسان کا فطری تقاضا ہے۔ آدمی غسل کر کے یا منہ ہاتھ دھو لے تو صفائی کی ضرورت پوری ہو گئی مگر یہ میک اپ، بیس پاؤڈر، اس پر سرخی، یہ لپ سٹک، یہ نیل پالش اور نہ جانے کیا کیا۔ ہمیں تو جن کے نام بھی نہیں آتے یہ سب کچھ کیا "نوافل" سے گہری دلچسپی نہیں۔

ایک مزدور دن بھر کام کرتا ہے۔ ایک ٹیچر ملازمت کرتا ہے ایک مزدور کی اجرت اور ملازم کی ماہانہ تنخواہ بالعموم اس کی بنیادی ضروریات پوری کرنے کے لئے کافی ہوتی ہیں مگر مزدور جب تک اوور ٹائم نہ لگائے جی نہیں بھرتا۔ ٹیچر جب تک ٹیوشن نہ پڑھائے طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ بلکہ اصل کام کی نسبت اوور ٹائم اور ٹیوشن پر زیادہ توجہ ہوتی ہے کہ دگنا معاوضہ ملتا ہے۔ لھذا ان "نوافل" پر انسان کی

توجہ زیادہ ہوتی ہے۔

اِن باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کی فطرت میں یہ خاصیت رکھی گئی ہے کہ وُہ صرف ضروری پر مطمئن نہیں ہوتا تو خالق انسان بھلا بندے اور رب کے درمیان تعلقات کے پہلو کو اس سے مستثنیٰ کیوں کرتا۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ دین فطرت نہ ہوتا، لھذا شریعت نے نوافل تجویز کر دئے تاکہ انسان کا یہ فطری داعیہ بھی پُورا ہو اور اُس کی عبادت کی تکمیل تزئین اور استحکام کی صُورت بھی بن جائے۔

بندے اور خالق کے درمیان جو تعلق ہے اس کی نوعیت بتاتے ہُوئے ارشاد ہُوا وَالَّذِینَ آمَنُوا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰہِ یعنی میرے بندے کی علامت یہ ہے اور اس کی خاصیت یہ ہے کہ اسے سب سے بڑھ کر مجھ سے محبت ہوتی ہے انسان کے اس فطری وصف کو سامنے رکھیں پھر دیکھیں کہ اگر اس کا ضمیر مر نہیں گیا تو آپ خواہ اسے صرف فرض نماز کی دعوت دیں اس کی طبیعت کو سُنّت اور نفل کے بغیر قرار نہیں آئے گا۔ جو انسان نما جانور دل سے نفس نماز ہی کو بوجھ سمجھے آپ اسے سنت چھوڑ صرف فرض کی دعوت دیں وُہ بخوشی مائل نہ ہوگا لھذا نئی نسل کو نماز کی حیثیت سے آگاہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اسے یقین ہو جائے اور وُہ محسوس کرنے لگے کہ اذان نہیں ہُوئی بلکہ مجھے اپنے محبُوب کے گھر سے دعوت نامہ آیا ہے۔ مجھے اپنی ملاقات کا شرف حاصل کرنے کا موقع دیا گیا ہے۔ میں کیوں نہ سر کے بل جاؤں، راز کی باتیں کروں، دِل کے دُکھڑے بیان کروں، اپنی آرزوئیں اور تمنّائیں محبُوب کے سامنے پیش کروں، یہ احساس ہو جائے تو فرض نماز سے فارغ ہونے کے بعد لازماً اس کا جی چاہے گا کہ محبوب کے پاس کچھ دیر اور بیٹھ لوں، کچھ اور باتیں کرلوں، بلکہ اس کا جی چاہے گا کہ سب دُنیا سے چھُپ کر رات کی تاریکی اور تنہائی میں اپنے محبوب سے ملاقاتیں کروں، پھر وُہ پچھلی رات اُٹھیگا اور ٹائم لگائے گا، اور کسی کے روکے نہیں رکے گا، اس لئے مجھے تو یُوں لگتا ہے کہ یہ

نوافل بوجھ نہیں بلکہ رَبُّ العالمین کی بندہ نوازی ہے اور انسانی فطری داعیہ کی تسکین کا سامان ہے بشرطیکہ اندر کا انسان زندہ ہو۔

۲۔سوال : نفل روزوں اور نمازوں کا اہتمام کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک اپنے گھر میں نفل نمازیں مثلاً تہجد وغیرہ پڑھنے کا تعلق ہے اس میں کوئی بات مانع نہیں لیکن اگر جہاں جائیں یا خود کہیں جائے مثلاً تعطیلات وغیرہ میں تو نفل نمازیں کس طرح ادا کی جائیں اس صورت میں نمود و ریا کا پہلو تو ضرور نکلتا ہے، اگر نہ پڑھے تو بھی طبیعت نہیں مانتی۔ نفل روزے کا مسئلہ اور بھی پیچیدہ ہے۔ مجبوراً بتائے تو وہی نمود و ریا اور عجب کا پہلو نمود و عجب کی نیت اگر نہ بھی ہو تب بھی وقت آنے پہ یہ خیالات پیدا ہو ہی جائیں گے۔ یہ بڑی اُلجھن محسوس ہوتی ہے۔

جواب : ریا یہ ہے کہ مخلوق میں اپنا مقام بنانے، وقار حاصل کرنے، واہ واہ کی خاطر کوئی کام کیا جائے یا کسی کام سے باز رہا جائے، ظاہر ہے کہ پہلے دل میں ارادہ یا نیت پیدا ہوتی ہے پھر کام کا آغاز ہوتا ہے وہ ارادہ یا نیت ہی دراصل اس کام کے کرنے یا چھوڑنے کی محرک ہوتی ہے۔ اگر ریا کی نیت سے کام شروع کیا ہے تو وہ از اوّل تا آخر ریا ہے، اور اخلاص یہ ہے کہ کوئی کام محض اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے کیا جائے یا کسی کام کو ترک کیا جائے، یہاں بھی ارادہ یا نیت کام کی ابتداء سے پہلے ہوگی۔

رہی یہ صورت کہ اگر کسی شخص نے محض اللہ کی رضا کی نیت سے کام شروع کیا، اس دوران اگر کسی نے اسے وہ اچھا کام کرتے دیکھا اور کام کرنے والے کو علم ہو گیا کہ کسی نے دیکھا ہے اس وجہ سے اس کے دل میں خوشی کی ایک لہر آگئی تو یہ انسان کی طبعی حالت ہے۔ غیر اختیاری ہے لھذا اخلاص کے منافی بھی نہیں اور ریا بھی نہیں اور غیر اختیاری پہ مؤاخذہ بھی نہیں۔

اصول یہ ہے کہ ایک ہے خیالات کا آنا یہ غیر اختیاری ہے، ایک ہے خیالات کا بہ تکلف لانا یا غیر اختیاری طور پہ کوئی خیال آجائے تو اختیاری طور پر اس پر جم جانا یہ انسان کے اختیار کی چیز ہے، غیر اختیاری پر مؤاخذہ نہیں اور اختیاری امور پر گرفت ہے۔ سمندر میں کشتی چل رہی ہو تو ملاح کے بس کی یہ بات نہیں کہ سمندر میں موجوں کے اُٹھنے کا عمل روک لے ہاں یہ اس کے بس کی بات ہے کہ موجوں کے نظارے میں کھو جانے کی بجائے منزل کی طرف بڑھتا چلا جائے۔

۳۔ **سوال:** آج کل چونکہ طلوع آفتاب کے صحیح اوقات کی سہولت موجود ہے لہٰذا اس کی روشنی میں بتلایئے کہ (i) تہجد کا وقت طلوعِ آفتاب سے کتنی دیر پہلے ختم ہوجاتا ہے۔ (ii) طلوعِ آفتاب سے کتنی دیر بعد نماز اشراق کا وقت شروع ہوجاتا ہے، اور کب تک رہتا ہے (iii) طلوع آفتاب سے کتنی دیر بعد نماز چاشت کا وقت شروع ہوتا ہے اور کب تک رہتا ہے۔

جواب: حسابی طریقے سے یا مسلسل مشاہدے سے تیار کیے ہوئے اوقات کے جو چارٹ ملتے ہیں ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انتہائی گرمی میں یہاں طلوع آفتاب سے قریباً ڈیڑھ گھنٹہ پہلے تہجد کا وقت ختم ہوجاتا ہے اور سردیوں میں یہ فرق زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ چالیس منٹ تک پہنچ جاتا ہے۔ اس لیے ڈیڑھ پونے دو گھنٹے طلوع آفتاب سے پہلے تہجد ختم کردینے چاہیں۔

(ii) طلوع آفتاب سے کوئی ۱۵ منٹ بعد اشراق کے نفل پڑھے جاتے ہیں اور سورج خوب بلند ہوجائے تو چاشت یا ضحیٰ کے نفل پڑھے جاتے ہیں، جن کا وقت زوال تک رہتا ہے۔

شریعت نے اوقات میں توسع رکھا ہے، ایک دیہاتی کو حضور اکرمؐ نے دو روز اپنے پاس ٹھہرایا ایک روز ساری نمازیں اوّل وقت پڑھیں دوسرے روز آخر وقت اور فرمایا کہ

نمازوں کے اوقات ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے ان نوافل کی حکمت یہ بیان فرمائی ہے کہ دن کے چار پہروں میں سے پہلے پہر میں فجر کی نماز ہوئی، تیسرے اور چوتھے پہر میں ظہر اور عصر کی نماز ہے دوسرے پہر میں عام مصروفیت کی وجہ سے کوئی فرض نماز مقرر نہیں ہوئی۔ مگر اہل محبت کو محرومی کے احساس سے بچانے کے لیے اشراق اور ضحیٰ کے نفل رکھے کہ کوئی یہ نہ سمجھے دن کا ایک حصہ محبوب کی ملاقات سے خالی گزرا۔

۴۔ **سوال:** اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْن مگر آپ ہمیں نماز کے لیے مجبور کرتے ہیں یہ قرآن کے خلاف ہے۔

جواب: لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْن کا مطلب یوں سمجھئے کہ آپ کسی شخص کو فوج میں بھرتی ہونے پر مجبور نہ کریں، مگر جو اپنی خوشی سے بھرتی ہو گیا اسے پریڈ کرنے اور وردی پہننے پر مجبور کریں بلکہ پورے اہتمام سے اسے A.R.I. کی پابندی پر مجبور کریں۔

اب آپ یہ بتائیں کہ آپ اپنی خوشی سے بھرتی ہوئے ہیں یعنی آپ کو کسی نے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ کی تصدیق اور اقرار پر کسی نے مجبور نہیں کیا تو گویا اب آپ خوشی سے بھرتی ہو گئے اب تو اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ آپ کو پوری اسلامی A.R.I. یعنی شریعت پر عمل کرنے پر مجبور کرے۔ اسلامی حکومت کے فرائض میں یہ بات سرفہرست آتی ہے اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ یعنی جن کو ہم اقتدار دیتے ہیں ان کا پہلا فرض یہ ہے کہ اقامت صلوۃ کا اہتمام کریں، دوسرا یہ ادائے زکوٰۃ کا نظام قائم کریں، اس کے بعد دوسرے امور آتے ہیں۔

نماز تو اس امر کا پہلا ثبوت ہے کہ آپ کفر کے دائرے سے نکل کر اسلام کے دائرے میں داخل ہو گئے ہیں۔ ایسا نہ کیجئے کہ بہانہ پیش کر دیں کہ ۳۰ برس کا

رام نکلتا نکلتا نکلے گا۔

۵۔ **سوال:** خدا نے ہمیں نماز پڑھنے پر کیوں مجبور کیا ہے۔ ہم نماز پڑھیں تو خدا کا کیا سنورتا ہے نہ پڑھیں تو اس کا کیا بگڑتا ہے۔ مجھ سے تو یہ بوجھ نہیں اٹھایا جا سکتا۔

جواب: آپ نے یہ فوجی وردی کیوں پہن رکھی ہے میں نے تو کبھی بھولے سے بھی نہیں پہنی؟

ہم تو فوجی ہیں ہمارے لئے وردی ضروری ہے آپ سویلین ہیں آپ کو اسکی کیا ضرورت؟

مگر کیا یہ فوج اپنے ملک کی نہیں، اور میں اس ملک میں نہیں بستا، جب فوج بھی اپنی اور میں بھی اسی ملک کا شہری تو فوج کا حکم مجھ پر کیوں نہیں چلتا؟

آپ اگر فوج میں بھرتی ہو جاتے تو فوج کا حکم آپ پر بھی لاگو ہوتا۔ جب آپ بھرتی نہیں ہوئے تو فوج آپ کو کیوں مجبور کرے کہ آپ فوجی قانون کی پابندی کریں معلوم ہوا کہ فوج صرف اسے مجبور کرتی ہے جو اپنی خوشی سے بھرتی ہو جائے جو بھرتی نہ ہو فوج اُسے پوچھتی بھی نہیں۔ تو بات صاف ہو گئی کہ خدا بھی کسی کو نماز پڑھنے پر مجبور نہیں کرتا بلکہ لوگ خود یہ ذمہ داری اپنے سر لیتے ہیں۔ اگر وہ بھرتی نہ ہوں تو مجبور کرنا دور کی بات ہے خدا انھیں نماز کے لئے کہتا ہی نہیں۔

چلئے اپنی خوشی سے بھرتی ہوئے مگر اس سے خدا کا کیا سنورتا ہے۔؟

آپ یوں کیوں نہیں سوچتے کہ ممکن ہے کہ اس سے بندے کا کچھ سنورتا ہو، دیکھئے آپ نے یہ کہیں نہیں دیکھا ہو گا کہ کوئی ڈاکٹر گلی گلی پھر رہا ہو، اور صدائیں لگا رہا ہو کہ یہ غذا کھاؤ یہ نہ کھاؤ، یہ دوا کھاؤ اتنی خوراک ہو دن میں اتنی بار کھاؤ۔ گویا کوئی ڈاکٹر کسی مریض کو کوئی خاص غذا یا دوا کھانے پر مجبور نہیں کیا کرتا، اور اگر کوئی مریض ہسپتال میں داخل ہو جائے تو وہ نہ اپنی خوشی سے کوئی

غذا کھا سکتا ہے، نہ اپنی مرضی سے کوئی دوا کھا سکتا ہے۔ ڈاکٹر کی تجویز کردہ غذا ہی اُسے ملے گی، اور اس کی بتائی ہوئی دوا ہی کھانی پڑے گی اور اتنی ہی مقدار میں اور اتنی ہی دفعہ کھانی ہوگی جو ڈاکٹر بتائے گا۔ کبھی آپ نے یہ بھی سوچا کہ ڈاکٹر نے اِس مریض کی آزادی کیوں سلب کر لی، اس کو کیوں اس قدر مجبور کر دیا اس میں ڈاکٹر کا کیا سنورتا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس میں ڈاکٹر کا کچھ نہیں سنورتا بلکہ ڈاکٹر تو مریض کی بہتری کے لیے ہی اُسے پابند کرتا ہے کہ ڈاکٹر کی ہدایات پر عمل کرے۔ ایک ڈاکٹر کے متعلق آپ کا ذہن یہ سوچ سکتا ہے حالانکہ ڈاکٹر اور مریض کا کوئی رشتہ بھی نہیں مگر اس خالق کے متعلق آپ یہ کیوں نہیں سوچ سکتے جس نے خود انسان کو پیدا کیا کہ اسے بھی اپنی مخلوق سے کچھ ہمدردی ہے، اُسے بھی اپنے بندے کی بہتری منظور ہے۔ فرض کیجئے آپ کا کور کمانڈر آپ سے کہے کہ آپ روزانہ میرے بنگلے پر آیا کریں ذرا ملاقات ہو جائے گی، باتیں کرینگے آپ میجر ہو کر پھولے نہیں سماتے کور کمانڈر سے روزانہ ملاقات ہوتی ہے اور پیشگی اجازت لینے کی ضرورت نہیں، کوئی پروٹوکول کا سوال نہیں تو خالق اگر اپنے بندے کو پانچ وقت روزانہ اپنے گھر بلا کر شرف ملاقات بخشے تو یہ خالق کی بندہ نوازی ہے یا یہ بوجھ ہے یہ تو وہی بات ہوئی کسی کو سانپ نے ڈس لیا اس کے منہ میں شہد ٹپکاؤ تو تھوک دے گا کہ سخت کڑوا ہے۔ شہد تو میٹھا ہے اور میٹھا ہی رہے گا اِس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ سانپ کا زہر دور ہو اور آپ کا ذائقہ درست ہو تاکہ آپ میٹھے اور کڑوے میں تمیز کر سکیں

ذکرِ الٰہی

ذکرِ الٰہی :

۱۔ سوال ۔ آج کل کے پیر فقیر یا صُوفیائے عظام اکثر ذکرِ الٰہی کرتے ہیں اور ذکر میں لفظ أَللهُ کو استعمال کرتے ہیں، حالانکہ یہ تلفظ قرآن مجید میں کہیں نہیں، قرآن مجید میں تو ایسا آتا ہے اللہ لا الٰہ الاھُوَ وغیرہ ، یا پھر اشارے کی ضمیریں آتی ہیں ۔
لہٗ ملك السموات والارض لہٗ میں ہٗ جو ہے اس کا اشارہ ماقبل کی طرف ہے۔
سمجھ میں نہیں آتا کہ غلط پڑھنے سے یہ ذکرِ الٰہی کیسے بن جاتا ہے اگر ذاتی نام کو ہی صحیح نہ پکارا جائے تو اس ذکر کا فائدہ ہی کیا ۔ اگر اللهُ والی ھا کو موقوف کریں تو اللہْ پڑھا جائے گا یہ صحیح رہے گا ۔

اگر حرف ہٗ کو اللہُ سے علیحدہ کریں تو أَلَّا رہ جاتا ہے جو اصل میں اَنْ لَا ہو گا، جب قانون عائد کریں گے اَنْ لَّا بنے گا جس کے معنی نفی کے بنیں گے تو پھر یہ کیسے ذکرِ خدا ہُوا۔

اِس لیئے اللہُ کے متعلق دلائل کے ساتھ جواب دیں

جواب : آپ نے سوال کی ابتدا جس جملے سے کی اس میں " آج کل " کے لفظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے تصوّف وسلوک کی کوئی کتاب اتفاق یا غلطی سے بھی نہیں دیکھی ورنہ " آج کل " کا لفظ لکھنے سے پہلے آپ سینکڑوں مرتبہ سوچتے
آپ نے " ان لاّ " کے جال میں جو اپنے آپ کو جکڑ رکھا ہے اس سے نکالنے کی کوشش کرتا ہوں نتیجہ اس کے ہاتھوں ہے جس نام کا تجزیہ کر کے حاصل تحقیق کو نفی تک پہنچایا أَللہ ھُوَ یہ اسم مفرد نہیں بلکہ مرکب تام یا جملہ ہے جو مبتدا

اور خبر سے مرکب ہے۔ اس کے دُو اجزا جب علیحدہ علیحدہ پڑھے جائیں گے تو تلفظ ہوگا اَللّٰہُ ھُوَ جب ان دونوں پر وقف ہوگا تو تلفظ یوں ہوگا اَللّٰہْ ھُوْ۔

تعجب ہے کہ جو حقیقت ایک فلاسفر اور مغربی تہذیب کے پروردہ مسلمان کی سمجھ میں آگئی وہ ایک مشرقی "حکیم"، اور ایک "ابن مولوی" کے ذہن میں نہیں آسکی۔ سُنیئے وہ کیا کہتا ہے :-

جہانِ دِل جہانِ رنگ و بُو نیست
دَر و پست و بلند و کاخ و کو نیست
زمین و آسمان و چار سو نیست
دریں عالم بجز اَللّٰہُ ھُوَ نیست

بلکہ وہ تو یہاں تک کہہ گیا ہے اور بڑے وثوق سے کہہ گیا ہے -

ے نصیب اوست مرگِ ناتمامے
مُسلمانے کہ بے اللہ ھُوْ زیست

۲۔ سوال : معلوم ہُوا ہے کہ جناب نے ذکرِ خدا کے لئے طریقہ جدید نکالا ہے نہ زبان سے ذکر ہوتا ہے یعنی سانس کے ذریعے ذکرِ خدا ہوتا ہے، سر بھی مارا جاتا ہے جیسے مجنون ہو اور ناک سے بھی کوئی آواز محسوس ہوتی ہے جیسے شوں شوں کی آواز، عرض ہے کہ یہ طریقہ ذکر جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے یا صحابۂ کرام سے یا کسی امام سے ...... یا کسی اور بزرگ دین سے براہِ کرم جواب سے مطمئن فرما دیں۔

جواب : آپ کے سوال کا پہلا جملہ ہے۔ " معلوم ہُوا ہے کہ جناب نے ذکرِ خدا کے لئے طریقہ جدید نکالا ہے "، تو سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ کو معلوم کیسے ہوا پھر دوسرا سوال ہے کہ یہ کیونکر معلوم ہُوا کہ یہ طریقہ جدیدہ ہے، تیسرا سوال یہ ہے

کہ یہ کیسے معلوم ہُوا کہ ہم اِس طریقہ کے موجد ہیں۔ اس جملے سے تو معلوم ہوتا ہے" کہ جہاں تک علم تصوّف وسلوک کا تعلق ہے آپ اس سے بال بال بچ گئے ہیں اور جہاں تک تصوّف وسلوک کے عملی پہلو کا تعلق ہے آپ نے اس کوچہ میں قدم ہی نہیں رکھا، بہرحال اگر آپ ذکرِ الٰہی اور لطائف کے متعلق علمی حد تک واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو حضرت شاہ ولی اللہ کی "الطاف القدس" کا مطالعہ فرمالیں اور جہاں تک دوسرے حق مختلف طریقوں کا تعلق ہے آپ شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی "ضیاءُ القلوب" کا مطالعہ فرمالیں۔ اس کے مطالعہ کے بعد آپ ایک اور مشکل میں پھنس جائیں گے ذکر اللہ، ذکر بہ ضربی، دو ضربی وغیرہ کا بیان پڑھ کر آپ سوچیں گے کہ یہ ضرب کوئی ہتھوڑے سے یا کلہاڑے سے ماری جاتی ہے، اگر یہ ضرب جسم کی حرکت یا سر کی حرکت سے سمجھی جائے تو آپ کا سوال کہ سر بھی مارا جاتا ہے" آپ کو اور پریشان کرے گا، اور اسے آپ جنون سمجھتے ہیں مگر نبی کریمؐ نے فرمایا کہ "اکثروا ذکر اللہ حتی یقولوا مجنون یعنی اللہ کا ذکر اس کثرت سے کرو کہ لوگ تمہیں دیوانہ کہنے لگیں، اس کا مطلب یہ ہُوا کہ یہاں تو دیوانہ بننا مطلوب ہے اور آپ کے نزدیک دیوانوں کی طرح ذکر الٰہی کرنا معیوب ہے، اب نبی کریمؐ سے آپ کا اختلاف دُور کیسے ہو، اللہ تعالےٰ ہی کوئی صُورت پیدا کردے ـــــ رہا یہ سوال کہ "کیا یہ طریقہ ذکر نبی کریمؐ سے یا صحابہؓ سے ثابت ہے" تو اس سلسلے میں ایک اصُولی بات عرض کرتا ہوں، ایک ہوتا ہے مقصد اور ایک ہوتا ہے ذریعہ یا تدبیر، مقصد علیٰ حالہٖ قائم رہتا ہے مگر تدبیر بدلتی رہتی ہے اور تدبیر کے بدلنے سے یہ ہرگز نہیں سمجھا جاتا کہ مقصد بھی بدل گیا ہے اس اُصول کو سامنے رکھیں اور ذیل کے سوالات پر غور فرمائیں۔

(۱) حضورؐ کے زمانہ میں جہاد فرض تھا اور مقصد تھا مگر ذریعہ یا تدبیر یہ تھی کہ تیر سے تلوار سے یا نیزے سے لڑائی ہوتی تھی، سواری کے لئے گھوڑا اور اُونٹ استعمال

ہوتا تھا، اب بھی جہاد فرض ہے مگر کیا اب بھی اسی تدبیر پر اکتفا کرنا پڑے گا جو اُس زمانے میں اختیار کی گئی ؟ کیا جدید آلات حرب اور سواری اور بار برداری کے لئے مشینی آلات کا استعمال اِس لئے ناجائز ہوگا کہ حضور اکرمؐ یا صحابہؓ کے زمانہ میں یہ طریقہ استعمال نہیں ہوا

(ب) تعلیم دین فرض ہے علیٰ قدر مراتب، حضور اکرمؐ کا طریقہ کیا تھا، آپ کیسے دین کی تعلیم دیتے تھے ؟ اب بھی دین کی تعلیم دینا اور حاصل کرنا ضروری ہے۔ مگر نبی کریمؐ اور صحابہ نے نہ تو صرف و نحو پڑھی، نہ بخاری اور ترمذی کا درس ہوتا تھا نہ جلالین، مدارک اور بیضاوی کی تدریس ہوتی، نہ ھدایہ شرح وقایہ سلم العلوم شرح جامی کے درس دیئے جاتے تھے۔ اگر تعلیم دین کے لئے یہ سب تدابیر اختیار کرنا دورِ نبوی اور دورِ صحابہ کی صریح مخالفت ہے تو دُنیا بھر کے دینی مدارس بند کر دینے ضروری ٹھیرے۔

(ج) تبلیغ و اشاعتِ دین فرض ہے، حضور اکرمؐ نے عمر بھر تبلیغ کی، مگر طریقہ کیا تھا۔ اگر اس کے بغیر کوئی اور طریقہ اختیار کرنا ایجاد بندہ ہے تو یہ کتابیں دھڑا دھڑ کیوں لکھی جارہی ہیں، ماہنامے اور ہفتہ وار رسائل کیوں پھیلائے جارہے ہیں، کیا اسے نبی کریمؐ کی مخالفت کا نام دیں گے۔ نبی کریمؐ نے حجۃ الوداع میں جبل رحمت پر کھڑے ہو کر جو خطبہ دیا تھا آپ کو معلوم ہے کہ سامعین کی تعداد کتنی تھی، اور کبھی آپ نے یہ بھی سوچا کہ اتنے آدمیوں تک حضورؐ کی آواز کیسے پہنچی ؟ یہ معجزہ تھا کہ حضورؐ کی زبانِ مبارک سے نکلے ہوئے الفاظ ہر کان تک یوں پہنچے جیسے پاس ہی کھڑا کوئی سنا رہا ہے لیکن آج اتنی مخلوق کو سنانے کے لئے لاؤڈ سپیکر کے استعمال کے بغیر کوئی صورت ممکن نہیں تو آج اس کا استعمال اس لئے ناجائز قرار پائے گا کہ حضورؐ یا صحابہؓ نے لاؤڈ اسپیکر استعمال نہیں کیا،

(د) آپ ایک آدمی کو کہتے ہیں کہ فلاں جگہ جو آدمی سو رہا ہے اسے آواز دو اور جگاؤ وہ تھوڑی دیر میں واپس آتا ہے کہ جناب میں نے آواز دی وہ نہیں جاگا، تو آپ اگر کہیں

کہ میں نے سینکڑوں آدمیوں کو اس طرح جگایا کہ آواز دی اور وہ اُٹھ کھڑے ہوئے بلکہ میں دبے پاؤں ان کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ آہٹ پاکر ہی بیدار ہو گئے، وہ کہے کہ حضرت آیئے ذرا یہ تجربہ اس گھوڑے بیچ کر سونے والے پر آزمایئے آپ آواز پہ آواز دیتے ہیں مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوتا، اب اس کی ایک صورت یہ ہے کہ آپ واپس آجائیں اور وہ سویا کریں، یہ صورت آپ اُس وقت اختیار کریں گے جب جگانا مقصود نہیں بلکہ یہ محض دِل لگی تھی دُوسری صورت یہ کہ آپ کو اسے ہر حال میں جگانا ہے اب آپ کو تدبیر میں تبدیلی کرنی پڑے گی۔ آواز دے کر آپ چھوڑ نہیں دیں گے بلکہ آپ اسے جھنجھوڑیں گے اس کے مُنہ پہ پانی کے چھینٹے ماریں گے، آپ اسے اُٹھا کر بٹھا دیں گے بلکہ اسے پکڑ کر چارپائی سے اُتاریں گے اور چند قدم چلائیں گے پھر جا کر اس کی آنکھ کھلے گی، کوئی آپ سے کہے کہ آپ نے یہ نیا طریقہ کیوں ایجاد کیا۔ تو آپ یہی کہیں گے کہ اسے جگانا مقصد تھا اور اس کے بغیر کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی، تدبیر تو محض ذریعہ ہے جسے بدلا جا سکتا ہے۔

اسی سے سمجھ لیجئے کہ حضور اکرمؐ کی نگاہ میں وہ اثر تھا کہ برسوں کے خفتہ قلوب بس ایک نگاہ سے بیدار ہو گئے۔ اب وہ نگاہ کوئی کہاں سے لائے کہ قتل کے ارادے سے آنے والا سامنے آئے تو قدموں میں گر پڑے۔ اب تو بھائی خفتہ دلوں کو جگانے کے لئے سو جتن کرنے پڑتے ہیں۔ مگر یہ کام وہی کرے جسے سونے والوں سے خیر خواہی ہو اور جسے اس محبت ہو جس نے جگانے کی ذمہ داری سونپی ہے۔

محبت کو سمجھنا ہے تو ناصح خود محبت کر
کہ ساحل سے کبھی اندازۂ طوفاں نہیں ہوتا

سوال ۳ (ا) اس عاجز کی عمر اس وقت ۷۵ سال ہے۔ کثرت ذکر کی عادت بچپن میں خاندان سے ورثہ میں ملی ہے، درسِ نظامی سے نکلتے ہی "غنیۃ للطالبین" "کشف المحجوب"، مولانا تھانویؒ کی کل تصانیف، مولانا احمد علیؒ کے تبلیغی رسائل

اور فتوح الغیب سے رُوحانی فیض لیا، ماشاء اللہ ذکر کی مواظبت اور اقامت صلوٰۃ طبیعت ثانیہ بن گئی ہے سُنت کی پابندی، اوقات معینہ کی مسنون دُعائیں اور تہجد بالالتزام بحمد اللہ عادت میں داخل ہیں، دلائل السلوک کے مطالعہ سے یہ کمی محسوس ہوتی ہے کہ کسی شیخ کامل سے فیض رُوحانی بھی حاصل کرنا ضروری ہے۔ لہذا مولانا اللہ یار خان صاحب مدظلہ سے استفادہ کا ارادہ ہے۔

(ب) اس فقیر کے خیال میں اقامت صلوٰۃ کی طرح اقامت دین نہایت اہم فریضہ ہے من لم یحکم بما انزل اللہ الخ فلا وربك لا یؤمنون الخ سے ظاہر ہے کہ اسلامی قانون یعنی نظامِ مصطفےٰ کے سوا کسی طاغوتی قانون کو برداشت کرنا اور اس غیر اسلامی ماحول میں چند ساعت ذکر و تسبیح کرنا اور اصلاح قلب کی کوشش میں رہنا باقی سارا وقت مرید کا ایسے ماحول میں گذارنا، جہاں چکلوں کی آمدنی سے ٹیکسی گندم خریدی اور کھلائی جاتی ہے۔ جہاں سُودی کاروبار اس وعید کے باوجود کہ فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ جاری ہے۔ ایسے ماحول میں چند گھنٹے شیخ کامل سے ذکر اللہ پھر چوبیس گھنٹے "ہے جمالو" کیا فائدہ دے سکتا ہے کام تو یہ ہے کہ تمام ذاکرین کو اقامتِ دین کے لئے خدا کے باغیوں کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔

(ج) تسبیح تو آسان ہے تمام غیر مکلف بھی تسبیح کرتے ہیں ہاں وہ تکبیر نہیں کر سکتے انسان خدا کا نائب ہے اس پر تسبیح سے بڑھ کر تکبیر کا فریضہ عائد ہوتا ہے، تلوار سے اسلام کی بڑائی ثابت کرے۔ وربك فکبر تاکہ ملک میں اسلامی پاکیزہ معاشی نظام رائج ہو۔ بقول اقبالؒ ؎

آفاق و افلاک میں تکبیر مسلسل یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
مذہب مردانِ خود آگاہ و خدامست یہ مذہب مُلاّ نباتات و جمادات

(د) مجلس ذکر میں جس طرح باہمی ذکر کا ذاکرین کو فائدہ پہنچتا ہے اسی طرح برا سے گناہ کا بھی انسان پر اثر ہوتا ہے ۔۔۔۔۔۔

(ر) اس گناہ گار کو ذکر و فکر عمر بھر کرنے سے کچھ نہیں ملا۔

(س) کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم سب کو اقامتِ دین کی کوشش کرنی چاہیے۔ تاکہ ذکر و فکر مؤثر اور پائیدار ثابت ہو۔۔۔۔۔

جواب : (ا) آپ کے گرامی نامہ میں مجھے جا بجا تضاد کے نمونے نظر آتے مگر میں نے اسکی توجیہہ یہی کی کہ ایک کم علم آدمی علماء کے ارشادات کا صحیح مفہوم سمجھنے میں ٹھوکر کھا ہی جاتا ہے لہذا یہ میری سمجھ کا قصور ہے۔

شروع میں آپ فرماتے ہیں کہ اہل اللہ سے رُوحانی فیض حاصل کیا ہے، اس کا اثر ہے کہ ذکر کی مواظبت اور اقامت صلوۃ طبیعت ثانیہ بن گئی ہے۔ سُنّت کی پابندی اور تہجد بالالتزام بحمد اللہ عادت میں داخل ہے۔ یعنی جہاں تک کسب، ریاضت محنت کا تعلق ہے آپ کی عملی زندگی اس قسم کی ہے جسے شریعت کی اصطلاح میں عمل صالح کہتے ہیں۔

جہاں تک قانون توارث کا تعلق ہے آپ فرماتے ہیں کہ کثرت ذکر کی عادت بچپن میں خاندان سے ورثہ میں ملی ہے۔ اور جہاں تک علمی پہلو کا تعلق ہے آپ فرماتے ہیں کہ درسِ نظامی کی تکمیل ہو چکی ہے، پھر آپ فرماتے ہیں کہ مولانا اللہ یار خان صاحب مدظلہٗ سے استفادہ کا ارادہ ہے۔ پہلا سوال یہ ہے کہ آپ اپنے اندر کس چیز کی کمی محسوس کرتے ہیں جس کے حصول کے لئے آپ استفادہ کا ارادہ رکھتے ہیں جبکہ عملی، علمی، اور موروثی کمالات تو سب کے سب آپ میں موجود ہیں بہرحال یہاں آپ ایک طالب، متلاشی وسائل کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش فرماتے ہیں اور آخر میں آپ فرماتے ہیں کہ "کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم سب کو اقامت دین کی کوشش

کرنی چاہیئے تاکہ ذکر و فکر مؤثر اور پائیدار ثابت ہو" یعنی آخر میں آپ استاد، ناصح، مُرشد۔ اور ہادی کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش فرماتے ہیں۔ اس تضاد کو کوئی کیسے دُور کرے۔

(ب) آپ فرماتے ہیں اِس فقیر کے خیال میں اقامت صلوٰۃ کی طرح اقامتِ دین نہایت اہم فریضہ ہے۔ ۔ ۔ ۔ ایسے ماحول میں چند گھنٹے شیخ کامل سے ذکر اللہ پھر چوبیس گھنٹے "ہے جمالو" کیا فائدہ دے سکتا ہے؟ اصل کام تو ہے کہ تمام ذاکرین کو اقامتِ دین کے لیے خدا کے باغیوں کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ جب آپ استفادہ کا ارادہ رکھتے ہیں تو خیال آرائی اور مشورہ دینے کا یہ کونسا موقع ہے اگر کوئی مریض کسی ڈاکٹر سے کہے کہ میں علاج کرانے کا ارادہ رکھتا ہوں پھر اسی وقت کہنا شروع کر دے کہ میرے خیال میں فلاں دوائی بڑی اچھی اور ضروری ہے تو ڈاکٹر اس کے بغیر کیا کہہ سکتا ہے کہ صاحب جب آپ خود دوائی تجویز کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں تو میرے پاس آنے اور علاج کرانے کا ارادہ ظاہر کرنے کا مطلب کیا ہے ذرا اس تضاد کو تو دُور کیجیئے۔

دُوسری بات یہ ہے کہ جو چیز آپ کو ورثے میں ملی تھی شاید اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اگر تھا بھی تو کم از کم ایسے ماحول میں جس میں آج ہم زندگی بسر کر رہے ہیں اس کا نہ کوئی مقام ہے نہ ضرورت تو ایسی میراث پر خوش ہونے کا کونسا موقع ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ " اقامت دین " کس بلا کا نام ہے۔ اگر دین سے مُراد اللہ اور اس کے رسُولؐ کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنے اور اس کی اشاعت کرنے کا نام ہے تو ذکر الٰہی کے متعلق اللہ و رسُول نے کیا حکم نہیں دیا۔ اگر سینکڑوں آیات قرآنی اور سینکڑوں احادیث نبویؐ میں ذکر الٰہی کی کثرت کا حکم پایا جاتا ہے تو اس حکم

کی تعمیل کرنا اور ذکر کرنا کیا دین سے الگ کوئی چیز ہے۔ اگر نہیں تو آپ اقامتِ دین کی مہم سے اس حکم کو کیوں خارج سمجھتے ہیں۔

چوتھی بات "اقامتِ دین کے لئے خدا کے باغیوں کا مقابلہ کرنا چاہیئے" مشورہ تو مناسب ہے مگر مقابلہ کے لئے سلیقہ بھی درکار ہے تیاری بھی ضروری ہے اسلحہ بھی چاہیئے اب دیکھنا یہ ہے کہ جس شخص کا خدا سے اتنا تعلق ہے کہ اس کا نام لینا بھی اسے گوارہ نہیں، وہ خدا کا بڑا ہی وفادار سپاہی ہوا، جو خدا کا باغی ہے وہ باغیوں کا مقابلہ کرے گا یا خود باغیوں میں شامل ہو کر ان کی قوت میں اضافہ کرے گا، جو شخص اپنے پانچ فٹ جسم پر دین کی چھاپ نہیں لگا سکتا اور اپنے ازلی دشمن شیطان کا مقابلہ نہیں کر سکتا جس نے اپنی چھوٹی سی سلطنت میں اپنے دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہیں جو اپنے قریبی ماحول میں عملاً شیطان کی برتری تسلیم کئے بیٹھا ہے وہ خدا کے باغیوں کا کیا خاک مقابلہ کرے گا، ایسے خدا بیزار تھڑدلے لذت پرست اور محض باتونی سپاہیوں سے مل کر جو فوج بنی ہو وہ خدا کے باغیوں کا مقابلہ کرے گی کیا اس مفروضے کو معقول تصور کرنے کے لئے کوئی ذی ہوش انسان تیار ہے۔ اس مہم کی تیاری اور سپاہی کے اسلحہ کی نشاندہی تو خود اس ذات نے کر دی جس نے چودہ صدیاں پہلے اقامتِ دین کی مہم چلائی تھی، حضور اکرمؐ کا فرمان تو آپ کو یاد ہوگا کہ شیطان کے حملوں سے بچنے کے لئے انسان کے لئے کوئی چارہ نہیں سوائے اس کے کہ انسان اپنے دل کے گرد ذکر الٰہی کا حصار تعمیر کر لے اور کما قالؐ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جو اسلحہ اتنے بڑے باغی کو شکست دینے کے لئے بقول رسولؐ کارآمد ہے وہ اس کی ذریت اور انسانی شیطانوں کے مقابلہ میں کوئی کام نہیں آسکتا۔ ذکرِ الٰہی تو در اصل ماحول کو بدلنے کی تیاری کا نام ہے پہلے خود کو بدلو پھر ماحول کو بدلو، اور یہ نرا دعوے نہیں تاریخی حقیقت ہے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ امام ربانی مجدد الف ثانی علی ہجویریؒ امام شامل ترکی کے پاس یہی اسلحہ تو تھا،

تاریخ بتاتی ہے کہ ہمیشہ حرا کے بعد بدر کا نمبر آیا کرتا ہے۔

(ج) انسان خدا کا نائب ہے اس پر تسبیح سے بڑھ کر تکبیر کا فریضہ عائد ہوتا ہے "

پہلی بات تو یہ ہے کہ تسبیح اور تکبیر میں مغائرت کا تصور کہاں سے پیدا ہوا ہے۔ کہ ایک کا وجود دوسرے کی نفی کو مستلزم ہے، حق یہ ہے کہ تسبیح کے بغیر تکبیر ہو ہی نہیں سکتی۔ جب عقیدے میں اس کی تسبیح اور تقدیس راسخ نہ ہوگی اس کی تکبیر کے لئے قدم کیسے اٹھیں گے، ذکر الٰہی کا اثر ہے کہ اللہ کی صفات پر یقین جم جاتا ہے۔ ذاکر جب لَا اِلٰہَ اِلا اللہ کہتا ہے کہ اس کے دل کی گہرائیوں میں یہ یقین پختہ ہو جاتا ہے کہ لانافع الا اللہ اس یقین کے بغیر خدا کے باغیوں کے مقابلہ کے لئے میدان میں اُترنا ایسا ہے جیسے ایک نہتا آدمی توپوں اور ٹینکوں کے مقابلہ کے لئے میدان میں آجائے۔ اور اگر تلوار اس کے ہاتھ میں ہو جس کے دل میں خدا کے علاوہ اور سب کی بڑائی کا عقیدہ راسخ ہو کیا اس تلوار سے اللہ کی بڑائی ثابت ہو سکے گی، وہ پاکیزہ معاشی نظام رائج کر سکے گا؟

دوسری بات یہ ہے کہ آپ کا مشورہ ہے آدمی ذکر الٰہی کے لئے اس وقت تک انتظار کرے جب پاکیزہ معاشرہ قائم ہو جائے، حالانکہ یہ ترتیب ہی الٹی ہے اللہ تعالیٰ تو فرماتے ہیں ولاتکونوا کالذین نسوا اللہ فانسھم انفسھم یعنی ان لوگوں کی مانند نہ ہو جانا جو اللہ کو بھلا بیٹھے ہیں اس کے نتیجے میں ان کی ایسی مت ماری گئی کہ اپنے نفع و نقصان کی سُدھ بُدھ بھی نہ رہی "یعنی جس طاغوتی ماحول میں ہم کھڑے ہوئے ہیں یہ تو نتیجہ ہے اللہ کو بھلا دینے کا، پھر یہ کیونکر ممکن ہو کہ ہم اللہ کی یاد کے قریب ہی نہ جائیں مگر ماحول پاکیزہ ہو جائے۔

رہا اقبال کے اشعار کا حوالہ دینا تو حقیقت یہ ہے کہ یار لوگوں نے اقبال کے کلام سے تو امرت دھارا کا کام لیا ہے۔ جب اقبال کا کلام ہی قول فیصل ہے

تو سُنئے ؎

جہانِ دِل جہانِ رنگ و بُو نیست — درو پست و بلند و کاخ و کو نیست
زمین و آسمان و چار سو نیست — دریں عالم بجز اللہ ھو نیست

بلکہ اس سے بھی زیادہ زوردار الفاظ میں فیصلہ دیتا ہے ؎

نصیب اوست مرگ ناتمامے
مُسلمانے کہ بے اللہ ھو زیست

(د) آپ فرماتے ہیں " مجلس ذکر میں جس طرح باہمی ذکر کا ذاکرین کو فائدہ پہنچتا ہے اسی طرح برائے گناہ کا بھی انسان پر اثر ہوتا ہے "

بات تو بالکل دُرست ہے۔ مگر اس سے ذکر سے بیزاری کا تاثر کہاں سے پیدا ہوتا ہے۔ اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ "برائے گناہ" کے حلقے سے لوگوں کو نکال کر ذاکرین کے حلقے میں داخل کیا جائے۔ تاکہ ذاکرین کا حلقہ وسیع ہوتا چلا جائے اور اس کے اثرات دُور دُور تک پھیلیں اور "برائے گناہ" کا حلقہ تنگ ہوتا چلا جائے اور اس کے اثرات کم ہوں، حضور اکرمؐ نے اپنی مکی زندگی میں بالخصوص ابتدائی تین برسوں میں یہی طریقہ اختیار فرمایا تبھی تو امام مالکؒ یہاں تک فرما گئے ہیں کہ لن یصلح اٰخر ھذہ الامۃ الا بما صلح اولھا

(ر) آپ فرماتے ہیں "اس گنہ گار کو عمر بھر ذکر و فکر کرنے سے کچھ نہیں ملا "

آپکی اس محرومی کا افسوس تو ضرور ہے مگر اس سلسلے میں چند امور قابل غور ہیں پہلی بات یہ محسوس ہوتی ہے کہ آپ نے ذکر و فکر کرنے سے پہلے یہ طے کر لیا ہو گا کہ مجھے یہ کچھ ملے گا، جب وہ نہ ملا خواہ اور بہت کچھ مل گیا ہو تو آپ نے یہی محسوس کیا کہ مجھے کچھ نہیں ملا، ایسا احساس عقلاً غلط ہے کیونکہ بندہ کی یہ طاقت نہیں کہ اپنی

پسند کے مطابق ہے بلکہ اس کا انحصار تو دینے والے کی پسند پر ہے پھر شکایت کیوں؟

دُوسری بات یہ ہے کہ آپ فرما چکے ہیں کہ ذکر و فکر کی عادت بچپن سے ورثہ میں ملی تھی۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس میراث کے ساتھ کیا اس امر کی تعیین بھی ورثے میں ملی تھی کہ ذکر و فکر سے یہ ملے گا۔ اگر یہی بات ہے تو آپ کا یہ احساس بجا ہے کہ کچھ نہیں ملا۔

تیسری بات یہ ہے کہ آپ نے شروع میں اللہ کی نعمتوں یا اپنے اوصاف اور کمالات بیان کرتے ہُوئے فرمایا ہے کہ "ذکر کی مواظبت اور اقامت صلوٰۃ طبیعت ثانیہ بن گئی ہے۔ سُنّت کی پابندی اور تہجد بحمد اللہ بالالتزام عادت میں داخل ہے"

تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ عمر بھر صرف ذکر ہی نہیں کرتے رہے بلکہ اقامتِ صلوٰۃ تہجد اور سُنّت کی بھی پابندی کرتے ہیں۔ ذکر و فکر سے تو بقول آپ کے آپ کو کچھ نہیں ملا، تو کیا اقامت صلوٰۃ تہجد اور سُنّت کی پابندی سے بھی کچھ ملا ہے یا یہ خانے بھی خالی ہیں تو جب ذکر و فکر سے کچھ نہ ملنے سے ان کی افادیت ختم ہو گئی اور آپ نے یقیناً یہ معاذ اللہ عبث کام چھوڑ دیا ہو گا تو صلوٰۃ و تہجد و اتباعِ سُنّت کا تکلف بھی چھوڑ دیا ہو گا خدا نخواستہ اگر صُورتِ حال یہ ہے تو بڑی افسوسناک ہے۔

دُوسری صُورت یہ ہے کہ اقامت صلوٰۃ تہجد اور اتباعِ سنت سے تو آپ کو کچھ مِلا ہے صرف ذکر و فکر سے کچھ نہیں ملا، اِس صُورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کے کرنے سے کیا ملا؟ ہر محنت کی مزدُوری کی تعیین کچھ تو خالق نے خود فرما دی ہے۔ البتہ اس مزدوری کے ملنے اور اس کے ظاہر ہونے کے محل جدا ہیں، مثلاً اقامت صلوٰۃ کا اثر فرمایا کہ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر کہ نماز بے حیائی کے کاموں سے اور گناہوں سے رُکتی ہے اِس لئے اگر نماز نے آپ کی عملی زندگی میں یہ اثر دکھا دیا تو ظاہر ہے کہ کچھ مِل گیا اسی طرح تہجد کا فائدہ بتایا کہ ان ناشئۃ اللیل ھی اشد وطأ اقوام قیلا یعنی رات کو اُٹھنا ہے تو بڑا ریاضت کا کام مگر اس کا اثر یہ ہے کہ ضبطِ نفس کا ملکہ پیدا ہوتا ہے

اور اپنے خالق سے جو باتیں ہوتی ہیں وُہ دِل کی گہرائیوں سے اُٹھتی ہیں، اگر تہجد کی پابندی نے آپ کی سیرت میں یہ بات پیدا کر دی ہے تو ظاہر ہے کہ کچھ مل گیا ہے۔ سُنّت کی پابندی اور احکامِ الٰہی کی تعمیل کا ایک صلہ اور بھی بیان ہُوا ہے کہ من یطع اللہ ورسُولہ فقد فاز فوزاً عظیماً۔ مگر اس فوزِ عظیم کا نظارہ اس وقت ہو گا جب فردِ عمل لپیٹی جا چکی ہو گی۔

اسی طرح ذکر کے بھی دو اثرات بیان ہُوئے ہیں اوّل الا بذکر اللہ تطمئن القلوب تو کیا آپ کو عمر بھر ذکر کرنے سے اطمینانِ قلب حاصل ہُوا یا نہیں، اگر حاصل ہُوا تو ظاہر ہے کہ کچھ مل گیا، اگر نہیں حاصل ہُوا تو اس کی دو صُورتیں ہیں اوّل یہ آپکو اس کی ضرورت ہی نہیں تھی اور آپ یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ آم کے درخت پر انار لگیں گے اور وُہ نہ لگنے تھے نہ لگے۔ دوسری صُورت یہ ہے کہ آپ نے عمر بھر ذکر نہیں کیا، بلکہ ذکر کی ایکٹنگ کی جب خالق نے آگ میں جلانے کی خاصیّت رکھی ہے تو کیسے تسلیم کر لیا جائے کہ آگ جل بھی رہی ہے اور نہ گرمی دیتی ہے نہ جلاتی ہے بلکہ برف کی قاش محسوس ہوتی ہے۔ تو معلوم ہُوا کہ آگ جلائی ہی نہیں گئی۔ بلکہ شعلوں کی تصویر بنائی گئی ہے

ذکر کا دوسرا اثر فرمایا فاذکرونی اذکرکم یعنی میرے بندو تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔ اس امر کی تعیین کہ وُہ بندے کو یاد کرتا ہے مادی ذرائع سے ممکن نہیں ایک ہی طریقہ ہے کہ بندہ اپنے خالق کی بات پر یقین کر لے، تو کیا آپ اپنے خالق کی اس یقین دہانی پر بھی یہ کہنے کی جراٗت کر سکتے ہیں کہ کچھ نہیں ملا تو اس کا کوئی علاج نہیں کیونکہ یہ تو "میں نہ مانوں" والی صُورت ہے۔

قرآن کریم کے بیان سے ایک اور حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی جسے اتباعِ سُنّت کہتے ہیں۔ کے لئے چند اوصاف درکار ہیں اول لمن کان یرجوا اللہ والیوم الآخر دُوسرا وذکر اللہ کثیراً گویا اتباعِ سُنّت وہی کر سکتا ہے

جو ذکر کثیر کا عادی ہو۔ تو جب آپ فرماتے ہیں کہ سُنّت کی پابندی عادت میں داخل ہے تو ظاہر ہے کہ ذکر الٰہی نے ہی آپ کے اندر سنت کا جذبہ اور سلیقہ پیدا کیا پھر آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ مجھے ذکر الٰہی سے کچھ نہیں ملا۔

سوال ۴ : میں خط جلد اس لیے نہ لکھ سکا کہ مجھے تنظیمی امور کے لیے آئندہ دو سال کا لائحہ عمل تیار کرنا تھا۔

جناب حافظ صاحب! ذکر سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے، سوال تو طریقہ ذکر کا ہے۔ میں آپ کو چھ سوال لکھ رہا ہوں واضح حوالے سے جوابات لکھ کر روانہ کریں۔ تاکہ میں اپنی تفتیش مکمل کروں اور اپنی جماعت کے اجلاس میں پیش کروں۔

(۱) جو طریقہ ذکر آپ حضرات کرتے ہیں اس کی ابتدا کس صاحب نے کی ؟

(۲) جس صاحب نے ابتدا کی اس کا تعلق کن علماء سے ہے ؟

(۳) کیا پاکستان کے تمام علماء اسے ولی یا مجدد مانتے ہیں ؟

(۴) کیا انہوں نے کسی ظالم حکمران کے سامنے حق کی آواز بلند کی۔

(۵) کیا انہوں نے تحفظ ختم نبوت، شان صحابہؓ کے لیے کبھی کوئی قربانی دی ہے

(۶) آپ سب لوگ انہیں ولی یا مجدد کیوں تسلیم کرتے ہیں۔

جناب حافظ صاحب میں نے مندرجہ بالا سوال ایسے لکھ دیئے ہیں جن کا جواب اب آپ کو یا آپ کی جماعت کے کسی دوسرے صاحب کو بالتفصیل اور حوالے دے کر دینا ہوگا اور اگر کسی سوال کا جواب کسی کتاب میں ہو تو وہ بھی ارسال کر دیں تاکہ میں اپنی تفتیش مکمل کر کے منظوری کے لیے اجلاس میں پیش کروں۔

طریقہ ذکر کے علاوہ چار سوال اور ہیں۔

(۱) یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہمارے دل اور رسول اللہؐ کے دل کے درمیان ایک باریک تار لگی ہوئی ہے۔

(۲) ۶ ماہ میں رسول اللہؐ سے شرف ملاقات آپ لوگ کس طرح حاصل کرتے ہیں۔
(۳) مردے کی رُوح سے کس طرح بات کی جاسکتی ہے۔
(۴) قبر کا عذاب کس طرح دیکھا یا دکھایا جاسکتا ہے۔

الجواب: آپ کے سوالات کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک حصّے کا تعلق پہلے چھ سوالوں سے ہے دوسرا بقیہ چار سوالوں سے متعلق ہے جیسا کہ خود آپ نے اظہار فرمادیا ہے جہاں تک پہلے حصّے کا تعلق ہے ایک اُصولی بات یہ ہے کہ ایک ہوتا ہے مقصد اور غایت دوسرا ذرائع اور تدابیر۔ مقاصد اور غایات نہیں بدلتے البتہ بدلے ہوئے حالات میں ذرائع اور تدابیر میں تبدیلی آسکتی ہے اور یہ تبدیلی صرف مقاصد کے حصول کے لئے ایک مناسب اقدام ہوتا ہے اس سے مقاصد کی نفی نہیں ہوجاتی مثال کے طور پر دیکھئے فن طب کا مقصد صحت جسمانی کا حصُول ہے۔ ایک وقت تھا کہ علاج کے لئے ٹھوس یا مائع ادویہ حلق سے اُتار کر معدے میں پہنچائی جاتی تھی اور معمولی بیماری کے لئے دنوں بلکہ ہفتوں علاج جاری رکھا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ طبائع میں نزاکت آنے لگی برداشت کی قوت کم ہوگئی تو اس فن میں نئے طریق علاج اختیار کئے جانے لگے اور زود اثر علاج کے لئے انجکشن اور بجلی کے ذریعے علاج ہونے لگا۔ اب اگر کوئی سادہ لوح کہے کہ پہلے اطبا علاج کے لئے دوائیں کھلایا پلایا کرتے تھے اب یہ کیا ستم ہے کہ علاج کے لئے جسم کو چھیدا جارہا ہے اور بجلی کے جھٹکے لگائے جارہے ہیں۔ ایسے دانشور کو اس کے بغیر کیا جواب دیا جاسکتا ہے کہ مقصد صحت کا حصول ہے اور تجربہ شاہد ہے کہ یہ طریق علاج نہایت زود اثر ہے اور کامیاب ہے مگر ساتھ ہی یہ طریقہ بذاتِ خود کوئی مقصد نہیں محض تدبیر ہے جو حالات کے بدلنے سے بدل سکتی ہے۔

اگر یہ اصُولی بات آپ کی سمجھ میں نہ آسکے یا آپ کو مطمئن نہ کرسکے تو آپ مندرجہ ذیل

سوالات پر غور فرمائیں ممکن ہے اس کوشش میں آپکو اپنے چھ سوالات کا جواب مِل جائے۔

(۱) چودھری صاحب! دین کا علم حاصل کرنے کی ضرورت سے کون انکار کر سکتا ہے سوال تو طریقہ تعلیم کا ہے۔ اس لئے آپ جواب دیں کہ :-

(i) جو طریقہ تعلیم اس وقت رائج ہے اس میں عموماً یہ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ صرف بہائی، نحو میر، کافیہ، شرح جامی، اصول الشاشی، قطبی، میبذی، صدرا، شمس بازغہ، قدوری، شرح وقایہ، ہدایہ اولین و آخرین، بخاری، ابوداؤد، ترمذی، مدارک، جلالین، بیضاوی، وغیرہ آپ ان میں ہر کتاب کے متعلق جواب دیں کہ سب سے پہلے کس نے یہ کتاب پڑھانی شروع کی۔ نبی کریمؐ کے زمانے میں ان کتابوں میں سے کوئی ایک کتاب بھی نہیں پڑھائی جاتی تھی۔

(ii) ہر کتاب کی تدریس شروع کرنے والے صاحب کا تعلق کن علماء سے تھا۔

(iii) کیا پاکستان کے تمام علماء اسے مجدد مانتے ہیں۔

(iv) کیا اُنھوں نے کسی ظالم حکمران کے سامنے حق کی آواز بلند کی۔

(v) کیا اُنھوں نے تحفظ ختم نبوت، شان صحابہؓ کے لئے کبھی کوئی قربانی دی۔

(vi) آپ لوگ اُنہیں مجدد کیوں تسلیم کرتے ہیں۔

(۲) چودھری صاحب! تبلیغ و اشاعت دین کے فریضہ کا کون منکر ہے۔ سوال تو طریقہ تبلیغ کا ہے اس لئے آپ جواب دیں کہ :-

(i) سب سے پہلے کس صاحب نے کتابیں تصنیف کر کے اشاعتِ دین کا کام شروع کیا، کس صاحب نے سب سے پہلے پمفلٹ چھپوا کر عوام میں پھیلائے؟ کس صاحب نے سب سے پہلے روزنامے، ماہنامے، اور سہ ماہی جرائد شائع کئے؟

جن صاحب نے سب سے پہلے یہ کام کئے ان کے متعلق پانچ سوالوں کے جواب دیجئے

(۳) چودھری صاحب! تقریر و بیان کے ذریعے دین کی آواز عوام تک پہنچانے کی ضرورت

سے کون انکار کرسکتا ہے سوال تو طریقۂ تبلیغ کا ہے اِس لئے آپ جواب دیں کہ :-

(۱) سب سے پہلے کس نے لاؤڈ سپیکر استعمال کرنا شروع کیا، نبی کریمؐ نے تو ایک لاکھ ۲۰ ہزار کے مجمع کے سامنے صرف اپنی زبان مبارک سے خطبہ دیا تھا اور سب نے حضورؐ کی آواز سُن لی تھی۔

(ii) ان صاحب کے متعلق بقیہ پانچ سوالوں کے جواب دیں۔

(۴) چودھری صاحب! جہاد فی سبیل اللہ کے فریضہ کا کون انکار کرسکتا ہے۔ سوال تو طریقۂ جہاد کی ہے اِس لئے آپ جواب دیں کہ :-

(i) سب سے پہلے کس نے بندوق سے جہاد کرنا شروع کیا؟ کس نے مشین گن سٹین گن، چلائی کس نے موٹر جیپ۔ ٹینک وغیرہ جہاد میں استعمال کئے، کس نے بحری جہاز تارپیڈو شروع کئے؟ کس نے بمبر اور فائٹر استعمال کئے حضورؐ کے طریق جہاد سے ہٹ جانے کی ابتدا کس نے کی؟

(ii) اس آدمی کے متعلق باقی پانچ سوالوں کے جواب دیں۔

(۵) چودھری صاحب! حج بیت اللہ، اسلام کا ایک عظیم رکن ہے، کوئی مُسلمان اِس حقیقت کا انکار نہیں کرسکتا، سوال تو بیت اللہ تک پہنچنے کے طریقے کا ہے، اسلئے آپ جواب دیں کہ :-

(i) گھوڑوں اور اُونٹوں کو چھوڑ کر سب سے پہلے کس نے موٹروں اور بسوں کے ذریعے حج کے لئے جانا شروع کیا؟ کس نے سب سے پہلے حج کے سفر کے لئے ہوائی جہاز کو ذریعۂ سفر بنایا۔

(ii) ایسے اشخاص کے متعلق باقی اپنے پانچ سوالوں کے جواب دیں۔

گو اس قسم کی اور بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں مگر میں نے طوالت سے بچنے کے لئے ان پانچ امور پر اکتفا کیا یہ پانچوں شعبے دین کے اہم امور ہیں، ذکرِ الٰہی بھی دین کا

اہم جزو ہے بلکہ ہر عبادت، ہر معاملہ اور اخلاق کی اصل روح ذکر الٰہی ہے اگر کوئی بڑی سے بڑی عبادت بھی ذکر الٰہی کی روح سے خالی ہو تو وہ محض صورت عبادت ہے حقیقت عبادت مفقود ہوگی، اِس لئے اِن سوالوں کے جو جوابات آپ کو مل سکیں گے وہی آپ کو ذکرِ الٰہی کے سلسلے میں بھی کام آئیں گے اور آپ کو پھر یہ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی کہ:۔

حافظ صاحب! ذکرِ الٰہی سے کون انکار کرسکتا ہے سوال تو طریقہ' ذکر کا ہے"

اچھا تو یہ ہے کہ آپ نے جس "نفیشی" جماعت کا ذکر کیا ہے یہ سوالات ان کے سامنے رکھیں۔ اور سب " محققین" مل کر ان سوالوں کے جواب تیار کریں، تاکہ آپ کی "تفتیش" مکمل ہو جائے۔

دوسرے حصے میں آپ نے جو سوالات لکھے ہیں ان سب میں قدر مشترک یہ ہے کہ "یہ "کس طرح ہوسکتا ہے" اس کا جواب حاصل کرنے کے دو طریقے ہیں، اوّل یہ کہ جو کام "کرنے" کا ہے وہ "کہنے سننے" سے نہیں ہوسکتا، مثلاً آپ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ آدمی خوش نویس کیسے بن سکتا ہے۔ تو آپ اِس فن کی کتابیں پڑھ کر تمام معلومات حاصل کرنے اور فنی باریکیوں کے جاننے کے باوجود خوشنویس نہیں بن سکتے۔ ہاں ایک طریقہ ہے کہ کسی ماہر خوشنویس کے پاس بیٹھیں اس کی ھدایت کے مطابق لکھنا شروع کریں اپنی صلاحیت کے مطابق کچھ عرصہ تک لکھتے رہنے کے بعد آپ خوش نویس بن جائیں گے، اگر آپ کی لکھائی ایسی ہے جسے پنجابی میں "داند موترنے" کہتے ہیں تو آپ کے اس سوال سے کہ آدمی خوشنویس کیسے ہوسکتا ہے۔ خوش نویسی کی نفی نہیں ہوسکتی۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ گھوم پھر کے دیکھیں کہ کیا دنیا میں خوشنویسوں کا وجود پایا جاتا ہے ؟ اگر ایسا ہے تو بھلے مانسی کا تقاضا یہ ہے کہ آپ یہ سوال بھی زبان پر نہ لائیں کہ آدمی خوش نویس کس طرح بن سکتا ہے

اِس اصولی تفصیل کا تقاضا یہ ہے کہ آپ یا تو اہلِ فن کے پاس بیٹھیں اور سیکھیں کہ

یہ کس طرح ہو سکتا ہے"۔ یا آنکھیں کھول کے تاریخ کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ کیا ایسے لوگ دُنیا میں پائے جاتے رہے ہیں یا نہیں۔

فن خوشنویسی کے متعلق جو باتیں کی گئی ہیں وُہ امور عادیہ میں داخل ہیں اور جو سوال آپ نے پُوچھے ہیں وُہ خرق عادت سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب امور عادیہ کے ضمن میں خود کرنے کی بجائے محض اعتراض کر دینے سے کام نہیں چلتا تو خرق عادات میں "کس طرح ہو سکتا ہے" کہہ دینا کیونکر کار آمد ہو سکتا ہے۔ اگر اسلام کی تاریخ میں صحابہؓ سے لے کر اب تک امور خرق عادات کا سرسری مطالعہ بھی کیا جائے تو شمار میں نہیں آسکتے۔ آپ یہ کہہ کر کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے" تاریخ کے اوراق سے ان واقعات کو کیسے کھرچ سکتے ہیں۔ مثلاً

(۱) اللہ تعالیٰ کا ایک برگزیدہ بندہ ایک لاکھ ۳۰ ہزار آدمیوں کے سامنے خطبہ دیتا ہے اور اس کی آواز ہر شخص سُن لیتا ہے۔ آپ کہیں گے یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ کا ایک مقبول بندہ دریائے نیل کو خط لکھتا ہے اور دریا اُس کے احکام پر چلنا شروع کر دیتا ہے۔

(۳) اللہ کے کچھ پیارے بندے ایک جنگل میں جاتے ہیں ان میں سے ایک فرد ایک بلند مقام پر کھڑا ہو کر اعلان کرتا ہے کہ اے جنگل کے درندو! ہمیں یہاں رہنا ہے اِس لئے یہ جنگل خالی کر دو، چنانچہ دیکھنے والے دیکھتے کہ درندے اپنے بچوں کو اُٹھائے بھاگے جا رہے ہیں۔ آپ کہیں گے یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔

(۴) نبی کریمؐ کا ایک غلام فسادات کے دنوں میں مسجد نبویؐ میں محصور ہو جاتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ میرے لئے اوقات نماز معلوم کرنا ناممکن ہو گیا تھا چنانچہ روضۂ اطہر کے اندر سے مجھے اذان سُنائی دیتی تھی اور یوں وقت نماز معلوم کرتے ہیں

کئی روز تک نمازیں ادا کرتا رہا، آپ کہیں گے یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ مردے بولیں اور زندے سُنیں۔

خرق عادت کی مثالیں کوئی کہاں تک بیان کرے۔ اس کی ایک صُورت یہ ہے کہ آپ مندرجہ ذیل کتب کا مطالعہ کریں:۔

(۱) الفتح الربانی .. .. شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ
(۲) مکتوبات امام ربانی .. .. حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ
(۳) الابریز .. .. سید عبدالعزیز دباغ رحمۃ اللہ علیہ
(۴) فتوحات مکیہ .. .. حضرت ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ
(۵) تفہیمات الٰہیہ .. .. شاہ ولی اللہ دھلوی رحمۃ اللہ علیہ
(۶) فیوض الحرمین .. .. شاہ ولی اللہ دھلوی رحمۃ اللہ علیہ
(۷) ضیاء القلوب .. .. حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ
(۸) التکشف عن مہمات التصوف .. .. .. حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ
(۹) مجلس ذکر .. .. حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ
(۱۰) الطاف القدس .. .. شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ

کتابوں کی فہرست دو وجہ سے دی گئی ہے اوّل یہ کہ آپ نے اپنے مکتوب میں اس کا مطالبہ کیا، دُوسرا یہ کہ آپ چونکہ محقق ہیں اس لئے تحقیق کا تقاضا یہی ہے کہ آپ ریسرچ کریں، اگر آپ مقلد ہوتے تو مجتہدین فی الفقہ اور مجتہدین فی التصوف کے فتاوے ہی کافی ہوتے۔ مگر آپ کے لئے مناسب یہی ہے کہ خود تحقیق کر کے کسی نتیجے تک پہنچیں۔

متفرق

۱۔ سوال : نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ کی موجودگی میں حضرت علی رض کو دُوسری شادی کرنے سے منع کیا تھا کیونکہ اس طرح حضرت فاطمہ کو تکلیف ہوتی لیکن اسلام میں بیک وقت چار شادیوں کی اجازت ہے۔ اِس طرح دُوسری بیویوں کی موجُودگی بھی پہلی کے لئے تکلیف دہ ہوسکتی ہے لھذا حضور اکرمؐ نے حضرت علیؓ کو اس سے کیوں منع فرمایا، اگر یہ استثنائی حالت تھی تو پھر گویا نبی کریمؐ کے لئے احکام اور تھے اور دُوسروں کے لئے اور نیز اس بات سے بعض لوگ تعدد ازدواج کی مخالفت کرتے ہیں اس کی توجیہہ فرمائیے۔

جواب : سب سے پہلے ایک اصُول سمجھ لیجئے کہ علماءِ عالم قانون ہوتے ہیں واضع قانون نہیں ہوتے۔ قانون کی علت صرف واضع قانون ہی بتا سکتا ہے دُوسری بات یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت اللہ تعالےٰ نے خود متعین فرمادی ہے کہ :

ما اتاکم الرسُول فخذوہ ومانھکم عنہ فانتھوا یعنی نبی کریمؐ جو تمہیں دیں لے لو، جس سے منع کریں رُک جاؤ۔ صاف ظاہر ہے کہ یہاں "کیوں" کی کوئی گنجائش نہیں رکھی۔ صحابہ گو روائتی علماء نہیں تھے لیکن حقیقی علم انہیں کا حصہ ہے۔ ہمارے یہاں علم کا طول و عرض بڑا ہے عمق برائے نام ہے ذرا سا کریدو نیچے سے جہالت نکل آئے گی صحابہ کے ہاں طول و عرض زیادہ نہیں لیکن گہرائی اتھاہ ہے لہذا صحابہ سے کسی مقام پر "کیوں" کا لفظ نہیں ملتا۔

تیسری بات یہ ہے کہ جس زبان سے چار کی اجازت کا حکم سُنا اسی زبان سے یہ ممانعت کا حکم بھی سُن رہے ہیں، اگر یہ کہا جائے کہ وُہ تو بات خدا کی تھی زبانِ مُصطفےٰ

کی یہاں بات اور زبان دونوں مصطفیٰ کی تو اس کا حل یہ ہے کہ جس کی وہ بات تھی اسکی یہ بات بھی ہے کہ وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ، تو ظاہر ہوا کہ زبانِ مصطفیٰ سے جو بات نکلی وہ بات خدا ہی کی تھی۔

اب رہی یہ بات کہ حضورؐ کے اس خصوصی حکم میں حکمت کیا تھی تو سمجھ میں کچھ اس طرح آتا ہے کہ حضور اکرمؐ کو حضرت علیؓ کی انتہائی خیر خواہی کا جذبہ اس حکم کا محرک بنا، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے :-

(ا) دوسری شادی بلکہ دنیا کے ہر کام کا محرک یا جلب منفعت ہوتا ہے یا دفع مضرت جہاں تک پہلے محرک کا تعلق ہے دوسری شادی کے سلسلے میں اس کی صورتیں مختلف ہوسکتی ہیں مثلاً اولاد کی خواہش، یا اپنے دست و بازو بڑھانے کا جذبہ وغیرہ دفع مضرت کی صورت تو یہ وجہ ہوسکتی ہے کہ مرد قوی ہو بیوی بیمار ہو اور آدمی بے راہروی سے بچنا چاہتا ہو، یا جائداد بہت ہو اور شریکوں کے ہاتھوں میں جانے سے بچانا چاہتا ہو۔

(ب) دوسری شادی سے جہاں مرد اور اس کے لواحقین کو یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کی آرزوئیں پوری ہونے کی صورت پیدا ہو رہی ہے وہاں پہلی بیوی اور اس کے متعلقین کو غم اور رنج کی گھٹائیں اٹھتی نظر آتی ہیں۔

(ج) بیوی کے لئے سوکن کا وجود اس لئے بھی سوہانِ روح بن جاتا ہے کہ اب خاوند کی توجہات کا مرکز صرف وہی نہیں رہے گی بلکہ یہ دولت بٹ جائے گی۔

(د) اذیت اور غم پھر دو قسم کا ہوتا ہے طبعی اور عقلی۔ انسان میں جب تک بشریت موجود ہے طبعی غم سے مفر نہیں۔ ہاں عقلی رنج اہل اللہ کو نہیں ہوا کرتا، جیسا حضورؐ کے بیٹے حضرت ابراہیمؑ کی وفات پر حضورؐ کی آنکھیں اشکبار ہوئیں مگر لب پر شکوہ نہیں اور دل میں بے صبری نہیں، گویا غم کے ردِ عمل کا ایک پہلو یہ ہے ایک پہلو وہ ہے

(۳) حضرت علی کے لیے دُوسری شادی کے ارادے کا محرک جلب منفعت کی خواہ کوئی صُورت ہو حضرت فاطمہؓ کے لیے یہ صُورت باعث اذیت ضرور ہوتی اور حضور اکرمؐ کو حضرت فاطمہؓ سے جو تعلق تھا اس کا لازمی تقاضا یہ تھا کہ اِس اذیّت کا اثر حضورؐ کی طبع مبارک پر بھی ہو، گویا حضورؐ کو طبعی رنج پہنچے۔

اَب آیئے قُرآن کریم کی طرف کہ نبی کریمؐ اور عام مومنین کے ساتھ برتاؤ کرنے میں قرآن کریم کیا ھدایات دیتا ہے، ارشاد ہے :۔

ان الذین یوذون اللہ ورسولہ لعنھم اللہ فی الدنیا وَالاخرۃ وَاعد لھم عذابًا مھینا —— یعنی جو لوگ رسُول کو ایذائیں پہنچائیں اُنکے لیے تین سزائیں مقرر ہیں۔ اوّل دُنیا میں وُہ ملعون، دوم آخرت میں ملعون، سوم آخرت میں رسوا کن عذاب، جہاں تک عام اہل ایمان کا تعلق ہے ارشاد ہوتا ہے :۔

والذینَ المؤمنین وَالمؤمنات بغیر ما اکتسبوا فقد احتملوا بھتانا و واثما مّبینا یعنی بغیر ما اکتسبوا کا اضافہ بھی ہے اور بہتان اور اثم مبین کا احتمال فرق تو ظاہر ہے۔ ایک اور پہلو بھی ہے کہ حضرت علیؓ کا ارادہ حضورؐ کو اذّیت پہنچانے کا تو نہیں تھا۔ تو اس کا حل بھی موجُود ہے کہ :——

لاتجھروالہ بالقول کجھر بعضکم لبعض ان تحبط اعمالکم وَانتم لاتشعرون یعنی تم نبی کریمؐ کو اس انداز سے نہ پکارو جیسے ایک دُوسرے کو پکارتے ہو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال حبط ہو جائیں اور تمہیں معلوم ہی نہ ہو۔

احکام کے اس تقابل کو پیشِ نظر رکھتے ہُوئے اب حالات کا تصور کیجیے ایک عام آدمی کے دوسری شادی کا فائدہ اور نقصان یہ پیشِ نظر تھا کہ اولاد ہو گی گناہ سے بچ جاؤں گا۔ یہ فائدہ دنیوی بھی ہے اور اُخروی بھی، دُوسری طرف بیوی نے سمجھا

میرے ساتھ انصاف نہیں ہوگا اسے اور اس کے لواحقین کو موہوم خطرے کی بنا پر اذیت پہنچی، ظاہر ہے کہ اس اذیت کے مقابلے میں وہ فائدہ جو دنیوی اور اخروی بھی ہے بہرحال زیادہ ہے عملاً بھی اور عقلی اعتبار سے بھی۔

حضرت علیؓ دوسری شادی کرتے ہیں۔ ان کو جتنے بھی دنیوی اور اخروی فوائد حاصل ہو جائیں ان کے ساتھ ایذائے رسول کی وجہ سے جو نقصان ہے وہ بہرحال بھاری ہے بس یوں سمجھ میں آتا ہے کہ حضورؐ نے حضرت علیؓ کو اس نقصان سے بچانے کے لیے منع فرمایا۔

رہا یہ سوال کہ حضورؐ اکرم کے لیے کیا احکام اور تھے اور دوسروں کے لیے اور تو اول تو ان دو آیتوں سے ہی یہ ظاہر ہے، پھر جو خصوصیات نبوی کو سامنے رکھا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے۔

تعدد ازدواج کی مخالفت کے لیے جو بہانہ بھی تراشا جائے نہایت بودا غیر عقلی اور ناقابل قبول ہے، اپنے تو بجائے خود پرائے بھی اعتراف کرتے ہیں کہ اسلام میں تعدد ازدواج کا مسئلہ ٹھیک انسانی فطرت اور اس کی نفسیات کے مطابق ہے۔ اور پرامن و پرسکون معاشرہ قائم کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ فرنچ مستشرق موسیو لیبان نے تمدن عرب میں اس پر خوب بحث کی ہے۔

رہا ان لوگوں کا سوال جو بظاہر اپنے ہیں مگر درحقیقت غیریت میں پرایوں سے بھی بہت دور ہیں ان کا معنوی شجرۂ نسب عبداللہ بن ابی سے ملتا ہے یہ تو اسلام کے ہر اس حکم پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں جو اُن کی پسند کے مطابق نہ ہو، آپ دیکھتے نہیں ابھی ماضی قریب میں جن اپنوں نے خدائی حکم میں ترمیم کی حماقت کی اور تعدد ازدواج پر قدغن لگائی خود اُن کے گھروں میں کتنی کتنی بیویاں ہیں اور ان کی آزاد شہوت رانی کے قصے زبانوں پر ہیں۔ یہ تو مشتے نمونہ از خروارے بھی نہیں۔

سوال : کچھ لوگ مسئلہ شفاعت پر بھی اعتراض کرتے ہیں اگرچہ متعدد احادیث سے شفاعت ثابت ہے لیکن پھر بھی سوال یہ ہے کہ جب جزا و سزا کا فیصلہ اعمال کی بنیاد پر ہوگا تو شفاعت کا کیا مطلب، نیز کیا شفاعت جہنم میں داخلہ سے قبل ہی ہوگی یا داخلہ کے بعد۔

جواب : شفاعت پر اعتراض کرنے والے نہ تو شفاعت کی حقیقت سے واقف ہیں نہ قرآن و حدیث سے آشنا ہیں، بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ وہ روزمرہ کے مسائل سے بھی آنکھیں بند کئے گذر جاتے ہیں۔

آپ لوگ جو محکمہ تعلیم سے تعلق رکھتے ہیں آپ کے لئے شفاعت کا مسئلہ سمجھنا تو بڑا آسان ہے۔ دیکھئے بورڈ اور یونیورسٹی کے امتحانات میں ایک عمومی اور جائز سفارش چلتی ہے جس کا اصطلاحی نام "گریس مارکس" ہے تو کیا یہ گریس مارکس اس امیدوار کو ملتے ہیں جس نے اپنی کوشش سے صفر نمبر لیا ہو یا جس نے پرچہ ہی نہ دیا ہو یا پرچے میں اول فول لکھتا رہا ہو، یا اُسے دئے جاتے ہیں جس کے نمبر اتنے کم ہوں کہ اگر گریس مارکس دئے جائیں تو وہ پاس ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ گریس مارکس کا مستحق دُوسری قسم کا امیدوار ہے۔ یہ اس رعایت یا سفارش یا شفاعت کا مستحق کیوں قرار دیا گیا؟ اس کیوں کا کوئی جواب نہیں اور اگر کوئی ہے تو وہی شفاعت کے مسئلے کا جواب ہے۔

شفاعت کے سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ باذن اللہ ہوگی یعنی یہ نہیں کہ جو چاہے جس کی چاہے شفاعت کرنے لگے۔

پھر جن کے حق میں شفاعت ہوگی وہ ایسے لوگ ہوں گے جن کا ایمان اور عمل میزان عدل میں اتنا کم نکلے گا کہ اللہ تعالیٰ کے قانونِ عدل کے ماتحت وہ بخشے جانے کے مستحق قرار نہیں پائے جا سکیں گے، اس استحقاق میں جو کمی رہ جائے گی وہ اللہ تعالیٰ

کے قانونِ فضل کے ماتحت شفاعت کے (GRACE MARKS) دیکر پُوری کردی جائے گی۔

یہ شفاعت ہر وقت ہو سکے گی پہلے اور بعد کا کوئی سوال نہیں جب اللہ چاہے گا اور جس کے متعلق اجازت دے شفاعت ہو جائے گی۔

۳۔**سوال :** ایک اور مسئلہ عذابِ قبر کا ہے یہ بھی اگرچہ ثابت ہے لیکن یہاں بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ حساب تو قیامت کے دِن ہو گا پھر اس سے قبر عذاب و ثواب کا کیا مطلب ؟ اور اگر عذاب و ثواب قبر میں ہی شروع ہو جاتا ہے تو پھر قیامت کو حساب و کتاب کس بات کا ہو گا۔؟

جواب : عذابِ قبر تو قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ضرورت اس بات کی تھی کہ اس سے بچنے کی فکر کی جائے مگر سوال ہوتا ہے کہ کیوں ہو گا گویا یہ کیوں اِس عذاب کو روک لے گی اسے سمجھنے کے لیے حیاتِ برزخیہ کا بالکل ابتدا سے جائزہ لیتے ہیں

(۱) حدیث کی رُو سے قبر میں جاتے ہی ہر ایک سے تین سوال ہوں گے۔

من ربك من نبيك وَمَا دينك عقل یہی کہتی ہے اور نقلاً بھی یہی ثابت ہے کہ تمام انسان ایک جیسا جواب نہیں دیں گے۔ کچھ ایسے ہوں گے جو صحیح جواب دیں کچھ دوسرے ایسے ہوں گے جو ھاھا لا ادری سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکیں گے

(۲) یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اِس کے بعد کیا سب سے ایک جیسا سلوک ہو گا ؟ جس پر عقل کی تہمت بھی لگی ہُوئی ہے وُہ یہی کہے گا کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، اگر ایک ہی جیسا سلوک کرنا ہوتا تو سوال پُوچھنے کی ضرورت کیا تھی۔

(۳) اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وُہ مختلف سلوک کس نوعیت کا ہو سکتا ہے۔ اس بات کو سمجھنے کیلئے ہم اپنے معاشرے اور اپنی حکومت کے حالات پر نگاہ دوڑاتے ہیں، ایک شخص پر الزام لگتا ہے رپورٹ ہوتی ہے ۔ FIR کے تحت

وُہ کسی ایسے جرم کا مرتکب بتایا جاتا ہے جو ناقابل ضمانت ہے اسے گرفتار کرکے حوالات میں بند کر دیا جاتا ہے ابتدائی تفتیش میں بھی وُہ زیادہ سے زیادہ ملزم قرار دیا جاسکتا ہے ابھی اس کا جرم ثابت نہیں ہوا وُہ مجرم نہیں ہے مگر حوالات میں اس وقت تک رہے گا جب تک اس کے کیس کا فیصلہ نہیں ہوجاتا۔ خواہ یہ کیس برسوں چلتا رہے حوالات کیا ہے۔ چھوٹا سا کمرہ تنگ و تاریک دِن وہیں بسر کرنا رات وہیں سونا، وہیں کھانا پینا وہیں ہگنا موتنا، مچھروں کی یلغار مکھیوں کی بھرمار تعفن اور بدبو کے بھبھوکے سامنے پھانسی کی رسی لٹک رہی ہے اسے تاحال کوئی سزا نہیں سُنائی گئی مگر کیا یہ سزا سے کم ہے اگر نہیں تو کیوں ہے اس حوالاتی کے ساتھ چاہے کتنی رعایت برتو روٹی گھر سے آتے ایک ایک وقت چھ چھ ٹفن کھانے کے آئیں مگر اس کا وزن گھٹتا جا رہا ہے رنگ اُڑتا جا رہا ہے کیوں؟ اس لیے کہ وُہ ائیر کنڈیشنڈ کمرے یاد آتے ہیں وہ فرج میں رکھی ہُوئی شیمپین وُہ فوم کے گدّے، وُہ اٹلی سے منگائے ہُوئے سامان سے آراستہ باتھ رُوم وہ یوڈی کلون کے معطر ہَوا کے جھونکے سب آسائش یاد آتی ہیں اس پرکسی کے ذہن میں سوال پیدا نہیں ہو کہ فیصلہ ہونے سے پہلے یہ سزا کیوں ہے۔ اگر سوال پیدا ہو بھی تو یہی جواب ملے گا کہ یہ ہے یہ تو انڈر ٹرائل ہے۔ جیل مینول کے مطابق اس کے ساتھ برتاؤ ہو گا جب تک فیصلہ نہیں سُنایا جاتا۔

اب آیئے قبر کی طرف جس نے غلط جواب دیا یا کوئی جواب نہیں دیا اسے کوئی سزا نہیں سُنائی جائے گی مگر اس کی قبر کو حوالات سے لعبیر کیا کہو گے تنگ و تاریک قبر سے سامنے دوزخ کی کال کوٹھڑی نظر آرہی ہے الاؤ دُھڑ رہے تپش پہنچ رہی ہے۔

النار یعرضون علیہا غدوا وعشیا ویوم تقوم الساعۃ ادخلوا آل فرعون اشد العذاب

جس نے ٹھیک جواب دیئے ہیں وُہ تو آیا ہے کہ اسے دعوت نامہ بھیجا گیا تھا

اس کی قبر کیا کمرۂ استقبال ( ) ہے ایئر کنڈیشنڈ لگے ہے

سجے سجائے کمرے ہیں، عمدہ تکیے ہیں، دل بہلانے کے لئے ریڈیو چل رہا ہے۔ T.V. پر پُر لطف منظر دکھائے جا رہے ہیں، عمدہ مشروب سے تواضع ہو رہی ہے۔ ضیافت کا وقت ابھی دُور ہے مگر اس وقت تک اس کا دل بہلانے کا ہر قسم کا سامان موجود ہے۔ یہ صورت ثواب قبر کی سمجھ لیجئے جبھی تو ایسے مہمانوں کو جب بلاوا آتا ہے تو اُن کے چہرے کھل جاتے ہیں۔

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم بر لب اُوست

یہ وُہ حقائق ہیں جو ہم ہر روز عملی طور پر اس گوشت پوست کی دُنیا میں دیکھتے ہیں مگر کوئی حیرت نہیں ہوتی پھر عذاب و ثواب قبر کیوں انوکھی بات محسوس ہونے لگے۔

رہی یہ بات کہ قیامت کے دن حساب کتاب کس بات کا ہوگا؟

تو سمجھ میں کچھ یوں آتا ہے کہ انسان کی ذمہ داری کے دو حصے ہیں ایمان اور عمل ایمان کا تعلق دِل سے ہے۔ اور بندے کے دِل کی بات خالق ہی خوب جانتا ہے۔ گویا ایمان تو بندے اور رب کے درمیان راز کا معاملہ ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اِس راز کے معاملے کو راز ہی میں نمٹا لیا جائے گا۔ قبر کی تنہائی ہے خالق کے دو نمایندے پُوچھ رہے ہیں بندہ جواب دے رہا ہے خالق یہ منظر دیکھ رہا ہے بس راز کی بات راز ہی میں نمٹا لی گئی۔

رہا عمل بھلا تو اس کا تعلق مخلوق کے ساتھ ہے۔ لہٰذا حساب لیا جائے گا تو سرِ عام، لہٰذا ظالموں کی رُسوائی ہوگی تو پُوری انسانیت کے سامنے اللہ والوں کی عزت ہوگی تو علی الاعلان، بے عمل اور بد عمل لوگوں کا تو کیا کہنا، اسلام کی خدمت، دین کی نصرت اور خلق خدا کی خیر خواہی کے جھوٹے دعوے کرنے والے اور مخلوق کو دھوکا دینے والے

گندم نما جو فروش میدان حشر میں ایک دو کے سامنے نہیں تمام بنی نوع انسان کے سامنے ننگے ہو جائیں گے عذاب الیم اور عذاب مہین سے شروع ہو جائے گا۔

۴۔ سوال : (۱) میں ایک دائمی بیمار اور مفلس آدمی ہوں ۱۹۴۵ء میں ایف اے پاس کیا کتابوں سے جنون کی حد تک پیار ہے مگر دینی تعلیم بالکل نہیں اور عمل کے معاملے میں بھی صفر ہوں۔

(ii) ۱۹۵۴ء میں ایک قادری بزرگ .... نے مجھے فقر عشق اور خودی جھلک دکھائی اور تربیت فرمائی کہ مشیت ایزدی، فیض محمد رسول اللہ اور دعائے .... سے مجھ نالائق سے اس شخص کا کام لیا جائے گا جسے اقبال نے اپنے کلام میں ابراہیم، کلیم، غزنوی نائب حق، سوار اشہب دوراں، بندۂ اللہ مست وغیرہ ناموں سے یاد کیا ہے جو فقر و عشق اور خودی کا حامل ہوگا اور دنیا میں ایک بڑا روحانی اور تمدنی انقلاب برپا کرے گا اور اسلام کو علی الدین کلہ غالب کرے گا۔

(iii) جن تجربات سے .... نے مجھے گذارا تھا ان سے مجھے کامل یقین ہے کہ یہ عظیم الشان کام مجھ ہی سے لیا جائے گا۔

(iv) .... نے ۱۹۶۰ء میں مجھے بیعت کیا اور میری تکمیل کئے بغیر ۱۹۶۱ء میں انتقال کر گئے جس کے بعد اب تک مجھے کوئی رہبر اور سرپرست نہیں مل سکا اور میں جسمانی، معاشی، اور روحانی اعتبار سے اس قدر پریشان ہوں کہ خودکشی کے سوا کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا۔

(v) مستدعی ہوں کہ مجھے فقر عشق اور خودی عطا فرمائیں تاکہ میں ؎

—— قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دوں

دھر میں اسم محمد سے اجالا کر دوں ——

جواب : مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ گوناں گوں غلط فہمیوں کا شکار ہیں اسی کا

اثر ہے کہ آپ کا دلی سکون غارت ہوگیا ہے۔ تفصیل عرض کرتا ہوں۔

(i) آپ فرماتے ہیں کہ آپ کے شیخ نے آپ کو اس منصب کے لئے انتخاب فرمایا۔ اور تربیت فرمائی جسے اقبال نے ..... الخ

سوال یہ ہے کہ آپ کے شیخ نے آپ کو اس عظیم منصب کے لئے انتخاب تو کرلیا اور آپ کو اطلاع بھی دے دی مگر آپ کو تیار کیوں نہ کیا۔ اگر ان سے آپ کی ہمہ پہلو تربیت اور تکمیل نہ ہوسکی تو اسی خداداد بصیرت سے آپ کو کسی ایسی ہستی کا پتہ بتا دیتے جس میں آپ کو اس عظیم کام کے لئے تیار کرنے کی اہلیت ہوتی مگر انہوں نے یہ دونوں کام نہیں کئے اور آپ کو وعدۂ فردا دے کر مرگ مسلسل میں مبتلا کر گئے۔ معلوم ہوتا ہے آپ ان کی بات سمجھ نہیں سکے۔ اہل اللہ کے کلام رمز و اشارات بھی ہوتے ہیں۔

(ii) آپ فرماتے ہیں "دینی تعلیم بالکل نہیں اور عمل کے معاملے میں صفر ہوں"۔ اگر یہ بیان کسر نفسی کی قبیل سے ہے تو اس کی ضرورت نہیں تھی اور اگر یہ بیان حقیقت ہے تو سوچئے کہ جس عظیم مقصد کے لئے آپ کو انتخاب کیا گیا ہے کیا اس منصب کے لئے دینی اعتبار سے جاہل ہونا اور بے عمل ہونا ہی دو ہتھیار ہیں، کیا ان وصفوں کے بل بوتے پر پوری دنیا میں روحانی اور تمدنی انقلاب برپا ہوتا ہے کیا معاذاللہ ابراہیم حکیم اور غزنوی کے پاس یہی اسلحہ تھا؟ کیا نائب حق اسی بل بوتے پر حق نیابت ادا کرتا ہے کیا سوار اشہب دوراں کا سرمایہ علمی و عملی یہی ہے؟ کیا اسلام کو علی الدین کلہ غالب کرنے کے لئے جاہل اور بے عمل ہونا ضروری ہے۔؟

(iii) آپ فرماتے ہیں "جن تجربات سے ..... نے مجھے گزارا ان سے مجھے مکمل یقین ہوگیا کہ یہ عظیم الشان کام مجھ سے لیا جائے گا"۔

سوچئے کہ ان تجربات کا ماحصل کیا ہوا، یہی نا! کہ دین سے ناواقفیت اور

عمل سے بے نیازی یا بیزاری، کیا اسی بنا پر آپ کو یقین ہو گیا، ادھر یہ یقین ادھر خودکشی کا ارادہ، بڑا تضاد ہے ـــــ معلوم ہوا یقین نہیں تھا فریبِ نفس تھا، اور اگر آپ نے اس ارادہ کو عملی صورت دے دی تو یہ عظیم الشان مہم کیا برزخ میں آپ سر کریں گے۔

(۱۱) آپ فرماتے ہیں "مجھے فقر، عشق اور خودی عطا فرمائیں"

یوں لگتا ہے گویا یہ چیزیں ریڈی میڈ سٹاک میں موجود رہتی ہیں، ادھر کسی نے دستِ طلب بڑھایا ادھر اس کی جیب میں ڈال دی گئیں۔ اگر آپ ان تینوں کی حقیقت علامہ اقبال کے کلام ہی سے سمجھنے کی کوشش کرتے تو یوں مطالبہ نہ کرتے، فقر عشق اور خودی کہیں باہر سے درآمد کرنے کی چیزیں نہیں ہیں، بلکہ ان کے سوتے انسان کے اندر سے پھوٹتے ہیں، فقر کو سمجھنے کے لیے اس حقیقت پر غور کریں کہ زندگی بسر کرنے کے دو اصول ہیں، ایک ہے اصول تجویز۔ کہ یوں ہو جائے، یہ مل جائے۔ یوں نہ ہو، وہ نہ ملے وغیرہ اس سوچ کا نتیجہ لازماً پریشانی ہے۔ دوسرا ہے اصول تفویض یعنی جو کام سپرد ہے پوری تندہی سے کرو اس دارالاسباب سے کام لو پھر نتیجہ اللہ پر چھوڑ دو۔ نتیجہ خواہ کسی صورت میں نکلے مطمئن رہو کہ یہ اللہ کا فیصلہ ہے اور اس کا فیصلہ کبھی غلط نہیں ہوتا بلکہ ہر فیصلہ کسی حکمت پر مبنی ہوتا ہے یہ اصول انسان کو طمانیت اور سکون کی دولت سے مالا مال کر دیتا ہے۔

اب سوچیے کہ جو شخص یہ دیکھے کہ میری خواہش پوری نہیں ہوتی خواہ وہ کتنی غیر معقول ہو تو وہ خودکشی کے لیے آمادہ ہو جائے اسے فقر باہر سے دستیاب ہونے سے رہا، فقر تو نام ہے خود سپردگی کا اپنی خواہش کو رب کائنات کی مشیت کے ماتحت کر دینے کا، اپنی پسند کو تج دینے کا، "میں" اور فقر کا کوئی جوڑ نہیں یہ تو جنون ہے کہ نظام کائنات میری مرضی کے تحت چلے، یہی تو شرک ہے، جہاں شرک ہو وہاں فقر کیسے آئے۔

عشق کا سرچشمہ بھی انسان کے اندر ہے، ہر انسان کے قلب میں یہ جذبہ موجود ہے

فرق اتنا ہے کہ معشوق مختلف ہیں، آپ بھی اس سے خالی نہیں آپ کو بھی سوار اشہب دوراں بننے کا عشق ہے مگر درحقیقت یہ عشق نہیں صرف ہوس ہے اور تمنا ہے اور تمنا ہے ورنہ عشق تو انسان کو سراپا عمل بنا دیتا ہے، آتش زیر پا بنا دیتا ہے ہاں عشق جو مطلوب ہے اس کی نشان دہی خالق عشق نے خود کر دی کہ وَالَّذِینَ اٰمنوا اشد حبا للہ یعنی ایمان ہی اس صفت کا ہے کہ اس کے موصوف کو سب چیزوں سے بڑھ کے اللہ سے محبت ہو اس نام جذبے کے لیے خالق نے عشق کا فرسودہ لفظ استعمال نہیں کیا، لہذا مطلوب تو محبتِ الٰہی ہے، مگر جو آدمی ذرا ذرا سی بات پر اللہ سے رُوٹھ جائے کہ میری خدائی کیوں نہیں چلنے دیتا تو ایسے شخص کو عشق بھلا کونسی مارکیٹ سے ملے گا۔

خودی نام ہے کائنات میں اپنا مقام پہچاننے کا یعنی خالق نے جمادات نباتات حیوانات کو انسان کی خدمت میں لگا دیا سخر لکم مَا فی السمٰوات وَ الارض اور انسان کو حکم دیا کہ بس میری بات مان جو میں کہوں وہی کر یہی مطلب ہے الا لیعبدون کا۔

تقدیر کے پابند جمادات و نباتات

مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند،

آدمی اگر یہ شرط لگا دے کہ یہ ملے گا تو بات مانوں گا ورنہ خودکشی کر لوں گا تو اسے خودی کہیں سے دستیاب نہیں ہو سکتی جس شخص کو یہ دھن سمائی ہو کہ دُنیا کا نظام میری تجویز کے مطابق چلے۔ مدبر کائنات میں بنوں اس کی خودی کا رشتہ تو ابلیسی خودی سے جا ملتا ہے۔ اقبال نے تو کامل خودی کا نمونہ تو نبی کریمؐ کی ذاتِ اقدس کو قرار دیا ہے۔ اس نے بھلا کیا قرار دینا تھا خود خالق نے جو اعلان کر دیا کہ لقد کان لکم فی رسُول اللہ اسوۃ حسنۃ خودی کی معراج تو کمال بندگی ہے —— حتیٰ یاتیك الیقین مگر بندگی مشروط نہ ہو ؎

تو بندگی چوں گدایاں بشرط مزد مکن — کہ خواجہ خود روشِ بندہ پروری داند

چند مشورے

(۱) مولانا تھانوی رحؒ نے لکھا ہے کہ ایک ولی اللہ کے پاس کوئی شخص سلوک سیکھنے آیا، آپ نے حلقہ میں بٹھایا توجہ شروع کی دیکھا کہ اس کا قلب انوار ذکر قبول ہی نہیں کرتا چند روز یہی ہوتا رہا، آخر آپ نے اس سے پوچھا میاں میرے پاس کیوں آئے ہو کہا اللہ اللہ سیکھنے آیا ہوں تاکہ میں بھی کچھ بن جاؤں اور دوسروں کو اللہ اللہ سکھاؤں، فرمایا اچھا اب جاہ کی گٹھڑی بغل میں دابے آئے ہو، توبہ کرو اس شرک سے اور اللہ کا بندہ بننے کی نیت سے اللہ اللہ کرو، اس نے توبہ کی آپ نے توجہ کی دیکھا کہ اس کا قلب انوار جذب کرنے لگا ہے۔

تو آپ نے پہلی ٹھوکر یہ کھائی کہ جب جاہ کا پشتارہ لے کر سفر کا آغاز کیا یہ سب غیر اللہ ہے پہلے اس سے توبہ کریں اور اللہ کا ذکر صرف اس نیت سے کریں کہ میں اسی لئے پیدا کیا گیا ہوں۔

(۲) اللہ کو مشورے دینا چھوڑ دیں، کام کریں اور اس کے فیصلے پر مطمئن ہو جائیں۔ وہ دیتا ہے بقدر ظرف دیتا ہے، بموجب حکمت دیتا ہے۔

؎ قابلیت بھی شرط ہے ورنہ • قطرہ قطرہ گہر نہ ہو جائے

(۳) سوار اشہب دوراں بننے کا جنون دل و دماغ سے نکال دیجئے کیونکہ جہالت اور بے عملی کے ساتھ اس منصب کا امیدوار ہونا اس منصب کی توہین ہے، اس کی جگہ اللہ کا بندہ بننے کا شوق اور جذبہ پیدا کیجئے۔

(۴) اگر آپ کو یہ مشورے پسند نہ ہوں تو بے شک ایسے آدمی کی تلاش میں رہیں جو آپکو سوار اشہب دوراں بنا سکے، میں تو اپنے اندر اس کی اہلیت نہیں پاتا، ہاں اگر خلوص سے تعلق مع اللہ کا طریقہ سیکھنا چاہیں تو جتنا کچھ آتا ہے بتا دیں گے پھر

اللہ جو چاہے آپ سے کام لے لے۔ تعلق اللہ سے ہی عشق بھی ابھرے گا، فقر بھی نصیب ہوگا، خودی کی تربیت بھی ہوگی۔ بس خلوص نیت شرط ہے۔ ملاوٹ والی چیز تو انسان بھی پسند نہیں کرتا اللہ تو بڑا نقاد ہے۔ اس کے ساتھ معاملہ کھرا رکھنا چاہیئے۔

۵۔ سوال: یہاں پر (واشنگٹن USA) لوگ اُلٹے اُلٹے سوال کرتے ہیں اس کا کیا کیا جائے مثلاً:——

(i) اللہ تعالےٰ کیا چیز ہے۔ (ii) اگر وُہ کوئی چیز ہے تو نظر کیوں نہیں آتا۔

(iii) زیادہ لوگ خُدا کو کیوں نہیں مانتے

( ) اگر اسلام سچّا دین ہے تو اس کے ماننے والے سچّے کیوں نہیں۔

( ) میری تقدیر میں لکھا ہوگا کہ میں نماز ادا کروں گا تو یہ ہوگا ورنہ نہیں۔

(vi) ایک شخص عیسائی تھا ساری عمر عیسائی ہی رہا، اِسلام کا اسے کسی نے نہیں بتایا اور وُہ اسی میں مرگیا تو اس کا کیا قصور۔

(vii) کیا مسلمانوں کے علاوہ دُوسرے لوگ جنّت میں نہیں جائیں گے۔

(viii) جھوٹ سے بچنا اور دُوسروں کو تکلیف نہ دینا کیا یہ کافی نہیں کہ آدمی کو جنّت مِل جائے۔

پہلا اور دوسرا سوال کرنے کی اصل غرض ایک تیسرا سوال ہے جس کا آپ نے ذکر نہیں کیا۔ اور وہ سوال یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی حقیقت معلوم نہیں اور وُہ نظر بھی نہیں آتا تو ہم اسے کیوں مانیں۔

اِن تینوں سوالوں کا جواب دینے کے لیے سائل سے یہ پُوچھنا پڑے گا کہ کیا آپ کی عملی زندگی کا بُنیادی اُصول یہی ہے کہ جس چیز کی حقیقت معلوم نہ ہو اور جو چیز نظر نہ آئے اسے آپ تسلیم نہیں کرتے، اگر ایسی بات ہے تو آپ کو خدا کے متعلق بھی یہ تینوں سوال کرنے کا حق ہے اور اگر یہ صُورت نہیں تو یہ سوال دراصل فرار کی

راہ تلاش کرنے کا ایک بہانہ ہے۔

ان سے پوچھئے کیا آپ تسلیم کرتے ہیں کہ آپ زندہ ہیں ظاہر ہے کہ ہاں کے بغیر وُہ کیا جواب دیں گے، تو زندگی کی حقیقت بتایئے۔ اگر زندگی یہ ہے کہ جسم میں رُوح موجود ہو تو پھر رُوح کی حقیقت بتایئے، اور یہ بتایئے کہ رُوح آپ نے دیکھی ہے، اگر یہ دونوں باتیں نہیں تو آپ زندہ ہونا کیوں تسلیم کرتے ہیں۔ پھر یہ ہے کہ زندگی کا مدار سانس کے آنے جانے پر ہے جس ہوا میں آپ سانس لیتے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے؟ کیا آپکو ہوا نظر آتی ہے۔ پھر آپ انجانی اور ان دیکھی چیز کو تسلیم کیوں کرتے ہیں۔

پھر زندہ رہنے کے لئے غذا کی ضرورت ہے غذا کی تیاری کے لئے حرارت کی ضرورت ہے وُہ حرارت خواہ آگ سے ملے یا بجلی سے۔ تو آگ اور بجلی کی حقیقت آپ جانتے ہیں۔ بجلی کے تار میں جو کرنٹ دوڑ رہی ہوتی ہے کیا وُہ آپ کو نظر آتی ہے اگر نہیں تو اس حقیقت کا انکار کر کے ذرا بجلی کے ننگے تار کو مس تو کیجئے۔

تجربہ شاہد ہے کہ عملی زندگی میں ہمیں اکثر بلکہ تمام تر معاملات میں جاننے والوں پر اعتماد کرنا پڑتا ہے کوئی مریض یہ نہیں کہتا جب تک دوائی کی حقیقت نہ جانوں اور اس کا عمل نہ دیکھوں میں تسلیم نہیں کرتا۔ تعمیر کے لئے انجینئر پر، قانون کے لئے وکیل پر تعلیم کے لئے استاد پر اعتماد کئے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتا، بلکہ بات تو یہاں تک پہنچتی ہے کہ وُہ معاشرے میں سے ایک مرد کو آپ نے باپ تسلیم کیا تو محض کسی کے اعتماد پر ایک عورت کو ماں تسلیم کیا تو صرف اعتماد پر، کبھی آپ نے کوئی ایسا شخص بھی دیکھا ہے کہ جب تک میں باپ بننے کی حقیقت نہ سمجھ لوں اور کسی کو باپ بنتا نہ دیکھ لوں اپنا باپ تسلیم نہیں کرتا، جب زندگی تمام معاملات میں اصول یہ ہے کہ جاننے والوں پر اعتماد کرو ورنہ جینا دوبھر ہو جائے گا تو خدا کے ماننے کے معاملے میں یہ اصول کیوں نہ اپنایا جائے اور ایک بالکل نیا اُصول وضع کرنے کی حماقت کیوں کی جائے۔

سوال ۶ : زیادہ لوگ خُدا کو کیوں نہیں مانتے۔

جواب : یہ دعوے ہی بنیادی طور پر محتاجِ دلیل ہے۔ کیا آپ نے پُوری دُنیا کے بسنے وَالوں کے اعداد و شمار جمع کئے ہیں اور اُن اعداد و شمار کی بُنیاد پر آپ حسابی طریقے سے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دُنیا میں زیادہ لوگ خدا کو نہیں مانتے۔ اگر ایسی بات نہیں تو اس دعوے کی بنیاد کیا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ دُنیا میں خُدا کے ماننے وَالوں کی تعداد زیادہ ہے۔ کسی نہ کسی نام سے خُدا کو مانتے ہیں، خدا کو بالکل نہ ماننے والے تو آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔

سائل کا اصل سوال یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ خدا کو نہیں مانتے خدا اُن سے زبردستی اپنے آپ کو منوا کیوں نہیں لیتا۔

تو اس کا جواب یہ ہے۔ کہ خدا نے انسان کو عقل شعور، اور ارادے کی آزادی دے کر اسے امتحان میں ڈال دیا، کہ یہ اپنے اختیار اور آزاد ارادے سے کام کیسے لیتا ہے۔ اگر اختیار کی آزادی نہ ہوتی تو امتحان کہاں رہتا۔ امتحان کی تیاری کے لیے ضرُوری ہے کہ کچھ لوگ تعلیم دینے وَالے ہوں اور کچھ تعلیم حاصل کرنے وَالے۔ اگر کسی کالج یا یُونیورسٹی میں طالب علم آوارہ اور معلم کام چور ہو جائیں تو ظاہر ہے کہ طالب علم امتحان میں فیل ہو جائیں گے اور معلمین کی .A.C.R خراب ہو جائے گی، کوئی پُوچھے کہ زیادہ طالب علم فیل کیوں ہو گئے تو اس کی وجہ اس کے سوا کیا بتائی جا سکتی ہے کہ تعلیم دینے والوں کی فرض ناشناسی اور غفلت اور طلبہ کی آوارگی اور بے فکری۔

سوال ۷ : اِسلام اگر سچّا دین ہے تو اس کے ماننے وَالے سچّے کیوں نہیں ؟

جواب : دین نام ہے ضابطۂ زندگی کا اور زندگی دو اجزا سے مرکب ہے

نظریہ اور اس کے مطابق عمل، جسے اسلام کی اصطلاح میں ایمان اور عمل صالح کہتے ہیں۔

جس طرح مروجہ فنون میں مہارت حاصل کرنے کے لئے تھیوری اور پریکٹیکل دونوں پر عبور ضروری ہے۔ اگر کسی شخص نے کسی فن کے نظریاتی پہلو میں کمال حاصل کرلیا ہے تو ظاہر ہے کہ اسے اس فن کی افادیت پر یقین ہے جبھی تو عمر کھپائی ہے مگر اس نے عملی پہلو کے سلسلے میں کبھی لیبارٹری میں قدم بھی نہیں رکھا۔ تو اس وجہ سے اس کا انکار کیونکر لازم آئے گا کہ اس نے نظری پہلو یا اس کی افادیت پر یقین کی وجہ سے اس میں عمر کھپائی ہے۔ ایک ڈاکٹر نے میڈیکل سائنس کا مطالعہ کماحقہ کیا ہے مگر اس نے سرجری کی عملی تربیت حاصل نہیں کی، اس وجہ سے وہ سرجن نہیں بن سکتا مگر کیا اس کے فزیشن ہونے کا بھی انکار کردیا جائے گا۔

یہ انفرادی زندگی کی چند مثالیں تھیں، اب آپ کے گھر کی بات کرتے ہیں، ریاستہائے متحدہ امریکہ کا ایک دستور ہے ایک آئین ہے اور امریکہ کا ہر شہری اس آئین کو تسلیم کرتا ہے، پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ نیویارک میں ۲۰ گھنٹے بجلی بند رہی تو چوری) وغیرہ کی چار ہزار وارداتیں ہوئیں، کوئی پوچھے کیا امریکہ کا آئین اور دستور اپنے شہریوں کو صرف چوری اور دوسرے جرائم کی تلقین کرتا ہے یا تعلیم دیتا ہے، اگر ایسی بات نہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر امریکہ کا آئین انسانیت نواز اور انسانیت پرور ہے تو امریکی جرائم پیشہ کیوں ہے۔ اور جو جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں کیا انھیں حکومت کا باغی سمجھا جاتا ہے یا صرف مجرم قرار دے کر مناسب سزا دی جاتی ہے۔

اب تو یہ بات سمجھنے میں دقت نہ ہوگی کہ اگر اسلام سچا ہے تو اس کے ماننے والے سچے کیوں نہیں۔ نیویارک میں ۲۰ گھنٹے کے دوران پیش آنے والے واقعات

کی جو توجیہہ آپ کی عقل رسا سوچ لے گی اسی توجیہہ سے یہاں بھی "کیوں" کا جواب مل جائے گا۔

سوال ۵ : میری تقدیر میں اگر لکھا ہے کہ میں نماز ادا کروں گا تو ہو گا ورنہ نہیں

جواب : یہ سوال تو "وہاں" کا ہرگز نہیں بلکہ کسی "یہاں" کی کسی بہانہ جو طبیعت نے وہاں جاکر اسلام سے جان چھڑانے کی ایک راہ نکال لی ہے بہر حال سوال وہاں کا ہو یا یہاں کا جواب کا مستحق تو ہے۔

پہلا سوال یہ ہے کہ تقدیر پہ ایمان ہونے کا تعلق صرف نماز کی حد تک ہے یا تقدیر کا عمل دخل پوری زندگی پہ پھیلا ہوا ہے۔ اگر تقدیر کی زد سے زندگی کا کوئی شعبہ بچا ہوا نہیں تو آیئے تقدیر کے عقیدہ کو پوری زندگی پہ لاگو کر کے دیکھیں۔

(i) اگر دولت مند ہونا آپ کی تقدیر میں لکھا ہے تو ہو گا ورنہ نہیں اس لئے بھاڑ جھونکنے اور در بدر خاک چھانتے پھرنے کی کیا ضرورت ہے، کسی کونے میں بیٹھ جایئے اور گنج باد آورد کا اِنتظار کھینچئے کیا آپ اس لئے تیار ہیں۔؟ اگر نہیں تو کیوں ؟

(ii) اگر آپ اعلیٰ درجے کا ڈاکٹر بننے کے لئے یہاں آئے ہیں تو آپ نے سخت غلطی کی اگر آپ کی تقدیر میں اچھا ڈاکٹر بننا لکھا ہے تو بنیں گے ورنہ نہیں، لہذا سات سمندر پار یہاں آکر داخلہ کے لئے کوشش کرنا پھر دن رات محنت کرنا، نری حماقت ہے گھر بیٹھئے اور اس وقت کا انتظار کیجئے کہ آپ کو ڈاکٹری کی اعلیٰ ڈگری غیب سے مل جائے کیونکہ تقدیر میں لکھا ہے تو ہو کے رہے گا، مشقت اُٹھانے کیا ضرورت، ان حالات میں آپ نے تقدیر پہ کبھی بھروسہ نہیں کیا بلکہ آپ مزدور یا ملازم ہیں تو فرائض منصبی کے علاوہ جب تک اوور ٹائم نہ لگالیں آپ کو چین نہیں آتا۔ اس وقت تقدیر آپ کا راستہ کیوں نہیں روکتی، جب آپ نماز کا ارادہ کرتے ہیں

تو تقدیر ہمالیہ بن کر آپ کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے اِس لئے آپ بامرِ مجبوری نماز کا نام تک نہیں لیتے کہیں تقدیر ناراض نہ ہو جائے کہ میری مخالفت شروع کر رکھی ہے۔

بات اصل میں یہ ہے کہ جیسے ہم کسی سے ناراض ہوتے ہیں تو بڑے زور سے کہتے ہیں کہ خبردار جو تو نے میرے گھر میں قدم رکھا، اسی طرح نادان اِنسان جب اپنی پے در پے بدتمیزیوں سے اپنے خالق کو اس حد تک ناراض کر دیتا ہے کہ اسکی (Invitation) پر بھی اس کی ملاقات کو نہیں آئے تو ادھر سے اِعلان ہو جاتا ہے کہ خبردار جو تو نے میرے گھر میں قدم رکھا۔ اُدھر سے یوں دھتکارے جانے کو فریب خوردہ انسان تقدیر کا بہانہ بنا کر دوسروں کو بھی ہم نوا بنانے کی کوشش کرتا ہے یہ ہے دامِ ہمرنگ زمین۔

سوال ۹ : ایک شخص عیسائی تھا، ساری عمر عیسائیت پر رہا، اسلام کا اس کو کسی نے نہیں بتایا اور وہی اسی حالت میں مر گیا اس کا کیا قصور؟

جواب : سوال کے آخری جملے سے ظاہر ہے کہ آپ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلانِ نبوت کے بعد کسی آدمی کا اسلام قبول نہ کرنا اور عیسائیت پر زندگی بسر کر دینا اور اسی حالت میں مرجانا قابلِ مواخذہ ہے۔ البتہ آپ نے جن حالات کا اظہار کیا ہے ان میں قصوروار کون ہے۔ یہ ہے اصل الجھن، ممکن ہے آپ سمجھتے ہوں کہ اصل قصوروار تو وہ لوگ ہیں جن کو یہ فرض سونپا گیا تھا کہ دعوتِ دین کے کام میں غفلت نہ کرنا۔ چونکہ اُنھوں نے اس بیچارے تک دین کی آواز پہنچائی نہیں لھذا وہ قصوروار نہیں ٹھیرایا جا سکتا۔

یہاں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ آپ کو اس امر کا یقین ہے کہ عیسائیت کا عقیدہ کسی عیسائی مشنری نے اس تک پہنچایا تب اس نے عیسائی مذہب قبول کیا۔ اگر اس امر کی کوئی قطعی شہادت نہیں تو اس کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ یا تو اس نے یہ مذہب ورثے میں پایا یا ذاتی جستجو اور مطالعہ کے بعد عیسائیت کو قبول کیا۔

یہ تو مسئلے کا ایک پہلو ہُوا، دوسرا پہلو یہ ہے کہ فرض کیا آپ اسے بے قصور قرار دیتے ہیں۔ تو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟

کیا کسی آدمی کے قصوروار . . . . یا بے قصور ہونے کا فیصلہ کرنے کا اختیار آپکو حاصل ہے یا اس کا فیصلہ کرنا اس کے اختیار میں ہے جو اعلان کر چکا ہے کہ لِلّٰہِ الواحد القھار اگر یہ فیصلہ کرنا اس کا اپنا کام ہے تو کیا اس نے آپ سے مشورہ طلب کیا ہے اگر نہیں تو کیا آپ اتنی طاقت رکھتے ہیں کہ بہ جبر اپنا فیصلہ اس سے منوالیں گے؟ اگر ان میں سے کسی بات کا امکان نہیں تو اس دماغی کُشتی سے آپ کا مقصد کیا ہے؟ تضیع اوقات کے علاوہ اور تو کوئی مقصد نظر نہیں آتا اور یہ کوئی ایسا مشغلہ نہیں کہ عمرِ عزیز کا کوئی لمحہ اس پہ ضائع کیا جائے۔

سوال ۱۰: کیا مسلمانوں کے علاوہ دُوسرے لوگ جنّت میں نہیں جائیں گے؟

جواب: جنّت اگر کوئی عوامی سیرگاہ ہے یا شاملات ہے تو جس کا جی چاہے گا چلا جائے گا، اور اگر اُس کا کوئی مالک ہے تو یہ اس کی مرضی پر منحصر ہے کہ جنّت میں داخلہ کے لیے جو شرائط چاہے مقرر کرے۔ اور جو شخص وُہ شرائط پُوری کرے اُسے جنّت میں داخل ہونے کی اجازت دے۔

فرض کیجئے کسی جگہ داخلہ کے لیے شرائط ایسی عام مشہور ہیں کہ ہر شخص جانتا ہے اب اگر کوئی شخص اپنے خیال کے مطابق وُہ شرائط پُوری کرتا ہے تو کیا دُرست ہوگا کہ مالک سے پُوچھے بغیر خود بخود وہاں گھُس جائے یا اُس کی صُورت یہ ہوگی کہ اس کے دعوے کی تصدیق اگر کوئی مالک کر دے اور اجازت دیدے تب داخلہ ملے گا۔

جب شرائط مقرر کرنا بھی مالک کے اختیار میں ہے۔ پھر ان شرائط پر کسی کو جانچنا بھی اسی کا کام ہے۔ پھر داخلہ کی اجازت دینا بھی اسی کے اختیار میں ہے۔ تو

آپ اس فکر میں کیوں گھلے جا رہے ہیں کہ فلاں جنت میں جائے گا اور فلاں کیوں نہیں جائے گا۔ اگر آپ جنت کے مشتاق ہی ہیں تو عقل سے مشورہ لیجئے وہ یقیناً آپکو یہی مشورہ دے گی کہ :——

(۱) پہلے یہ معلوم کرو کہ جنت کا مالک کون ہے۔

(۲) اس نے جنت میں داخلے کے لئے کیا کوئی شرائط مقرر کی ہیں۔

(۳) اگر کچھ شرائط ہیں تو کیا میں اُن شرائط کے پورا کرنے کی کوئی عملی تدبیر کر رہا ہوں۔

(۴) اگر نہیں تو مجھے جنت کے متعلق سوچنے سے بے نیاز ہو جانا چاہیئے، اگر یہ نہیں تو ان شرائط کو پورا کرنے کی فکر کرنی چاہیئے۔

یہ تو ہوئی جنت میں داخلہ کے متعلق بات مگر اصل کام جو آپ کے کرنے کا ہے وہ اور ہے۔ مختصر الفاظ میں اصل کام یہ ہے کہ :——

(۱) آپ یہ سوچیں کہ آپ کا اپنے خالق سے کوئی تعلق ہے ؟

(۲) اگر ہے تو اس تعلق کو پختہ کرنے اور بنانے کیلئے اپنے خالق سے کوئی معاہدہ کیا ہے

(۳) اگر ایسی بات ہے تو اس معاہدہ کے بعد آپ نے اپنے ذمے کونسی ذمہ داری لی ہے۔

(۴) معاہدہ کے مطابق جو ڈیوٹی آپ کے سپرد ہے آپ کو اس کی فکر کرنی چاہیئے۔

اس سے آگے آپ کی حد ختم ہو جاتی ہے۔ جب آپ نے معاہدے کے مطابق اپنی ذمہ داری پوری کر لی تو کیا خیال ہے کہ خالق اس معاہدے کے مطابق آپ کو صلہ دینے میں کوئی بخل کرے گا۔؟

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن
کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

سوال ۱۱ : جھوٹ سے بچنا اور دوسروں کو تکلیف نہ دینا کیا یہ کافی نہیں کہ "آدمی" کو جنت مل جائے۔؟

(ج) یہ "آدمی" بھی اچھا خاصا معمہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ "آدمی" کو جنت کی ضرورت کیا ہے؟ کیا جنت کے بغیر گذر بسر نہیں ہو سکتی؟ اگر جنت کوئی ایسی پُرکشش جگہ ہے کہ "آدمی" کا دل خواہ مخواہ اس کی جانب کھچا چلا جاتا ہے تو آدمی کو یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ اسے پُرکشش بنانے والا اس کا مالک ہی تو ہے۔

آپ یہ سوچیں کہ گھر آپ کا ہے۔ اور "آدمی" یہ کہے کہ اس گھر میں داخل ہونے کے لیے کیا یہ کافی نہیں کہ لباس صاف ستھرا ہو۔ میک اپ خوب کی گئی ہو۔ تو کون باور کرے گا کہ "آدمی" کے حواس ٹھکانے ہیں۔ یہاں تو سب سے پہلے یہ دیکھنا پڑے گا کہ گھر کے مالک سے "آدمی" کی واقفیت بھی ہے یا نہیں ہے۔ اور واقفیت محض جاننے کی حد تک ہے یا شناسائی بھی ہے۔ اگر شناسائی ہے تو کیا روابط اس قسم کے ہیں کہ آمد و رفت ہوتی رہتی ہے۔ اگر یہ سب باتیں بظاہر ٹھیک نظر آتی ہیں تو یہ پہلو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ساری ایکٹنگ کسی سازش کے تحت ہے یا واقعی قلبی تعلق ہے۔ اگر گھر کا مالک جانتا ہو کہ میرا حقیقی دشمن ہے مگر دکھاوے کے لیے یہ ساری حرکتیں کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ آپ جو گھر کے مالک ہیں اس صاف ستھرے بنے ٹھنے "آدمی" کو گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیں گے۔

بس اسی پر جنت میں داخلہ کے متعلق قیاس کر لیجیے۔

آیئے گھر کی مثال لیتے ہیں۔ فرض کیا آپ واشنگٹن میں کسی فیکٹری میں ملازمت کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کے پاس مطلوبہ ڈگری موجود ہے۔ کئی سالہ تجربہ کا سرٹیفکٹ موجود ہے آپ ٹسٹ میں پورے اترے ہیں مگر فیکٹری کا مالک آپ کو ملازمت دینے کے لیے تیار نہیں، آپ اس سے وجہ دریافت کرنے پر زور دیتے ہیں تو وہ کہتا ہے کہ امریکہ ہے اور میرے پاس شہادتیں موجود ہیں کہ آپ کمیونسٹ

ہیں لہذا میں اس پُرامن ماحول میں آپ کو داخل ہونے کی اجازت نہیں دوں گا۔ لیجئے آپ کی ڈگریاں دھری کی دھری رہ گئیں۔ آپ کا تجربہ کسی کام نہ آیا۔ اور آپ کا کمیونسٹ ہونا آپ کی تمام خوبیوں کو لے ڈوبا۔ لطف یہ کہ آپکو اس پر کوئی تعجب بھی نہ ہوگا اور شکایت بھی نہ ہوگی۔ کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ یہ رُوس نہیں امریکہ ہے۔ تعجب اس بات پر ہے کہ جنّت میں داخلہ کے سلسلے میں آپ بڑے (Free thinker) کیوں بن گئے ہیں۔

سوال ۱۲ : ہمارے علماء کی یہ حالت ہے کہ اگر ایک عام آدمی اسلام کی واقفیت حاصل کرنے یا اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے کا طریقہ سیکھنے کے لئے ایک عالم کے پاس جاتا ہے تو وہ جہاں اس کی کچھ رہنمائی کرتا ہے وہاں دُوسروں کو خُوب لتاڑتا ہے، دُوسرے کے پاس جاتا ہے تو وہ پہلے کو کافر اور نہ جانے کیا کیا کہتا ہے۔ اسی طرح ہر عالم دُوسرے کے خلاف زہر اُگلتا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ عام آدمی ایسے حالات میں اسلام پر عمل کرے تو کیسے اور سیکھے تو کہاں سے ؟

جواب : اس عقدے کا حل کوئی زیادہ مشکل تو نہیں البتہ اس راہ کی ایک رکاوٹ عام ہے کہ انسان کے سامنے روزمرہ زندگی میں بے شمار ایسے مناظر آتے ہیں کہ وہ فی نفسہٖ ٹھوس حقائق ہوتے ہیں اور انسان ان سے بڑے قیمتی سبق سیکھ سکتا ہے لیکن انسان ان مناظر پر کوئی توجہ نہیں دیتا اور سرسری نگاہ کر کے وہاں سے گذر جاتا ہے اس عقدے کے حل کے ضمن میں بھی یہی صُورت حال پیش آئی ہے

اِس اجمال کی تفصیل کچھ یوں سمجھئے کہ آپ کسی قصبے میں گھوم جائیں وہاں آپ کو جا بہ جا ڈاکٹروں اور طبیبوں کی دکانیں نظر آئیں گی کوئی ایلوپیتھ ہے کوئی ہومیوپیتھ ہے۔ کسی نے حاذق الحکماء کا بورڈ لگایا ہوا ہے کوئی آیورویدک طریق علاج اپنائے بیٹھا ہے۔ اب صُورت حال یہ ہے کہ ایک عام مریض

جب کسی ہومیوپیتھ کے پاس جاتا ہے تو وہ ایلوپیتھی اور یونانی طب پر یوں برستا ہے جیسے یہ لوگ صرف اِس لئے دکان کھولے بیٹھے ہیں کہ مریضوں کو موت کے ویزے جاری کرتے رہیں۔ اسی طرح اگر وہ کسی ایلوپیتھ کے پاس جاتا ہے تو وہ ہومیوپیتھی کے وہ بخیے اُدھیڑتا ہے کہ خدا کی پناہ۔ اور یونانی طب کو وہ صلواتیں سناتا ہے کہ انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ یہ حالات روزمرہ زندگی میں عام پیش آتے ہیں مگر ایک عام آدمی جو علاج کرانا چاہتا ہے یہ نہیں سوچتا کہ میں کہاں جاؤں اور کس سے علاج کراؤں یا سرے سے علاج کرانے کے متعلق سوچنا ہی چھوڑ دوں یا یہ کہ اپنی اٹکل سے اپنا علاج کرنا خود ہی شروع کر دوں، بلکہ عام آدمی یہ سوچتا ہے کہ یہ سب ڈاکٹر اور طبیب ایک دوسرے کے مخالف سہی مجھے اپنے علاج سے غرض ہے اس لئے اس کی فکر کروں چنانچہ اس غرض کے لئے وہ مختلف احتیاطی تدابیر کرتا ہے مثلاً سب سے پہلے یہ دیکھتا ہے کہ ان میں مستند طبیب یا ڈاکٹر کون ہے، پھر یہ دیکھتا ہے کہ کس کا تجربہ زیادہ ہے۔ عام آدمی چونکہ اس فن سے واقفیت نہیں رکھتا اِس لئے یہ تو کر نہیں سکتا کہ علمی بنیادوں پر کسی ڈاکٹر یا طبیب کی فنی اہلیت کا جائزہ لے سکے اس لئے صرف ایک ہی معیار استعمال کیا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ عام آدمی یہ دیکھتا ہے کہ کس طبیب یا ڈاکٹر کی شہرت اچھی ہے۔ کس کا برتاؤ مریضوں کے ساتھ مشفقانہ ہے اور کس کے پاس آنے والے مریضوں میں سے اکثر شفایاب ہوتے ہیں۔ یعنی یہ دیکھتے ہیں کہ کس کے ہاتھ میں شفا ہے۔ بس اس پر اعتماد کر کے اس سے علاج کرانا شروع کر دیتے ہیں دین کے معاملے میں بھی بالکل یہی روش مناسب معلوم ہوتی ہے۔ ایک عام آدمی کو جسے دین سے واقفیت نہیں اسے یہ احساس ہونا چاہیئے کہ رُوح کی صحت کے لئے دین کی واقفیت ہونا اور اس کے مطابق عملی زندگی بسر کرنا ضروری ہے اور چونکہ مجھ میں ان دونوں اوصاف کی کمی ہے لہذا میری حیثیت ایک بیمار کی،

دوسرا اس کے اندر یہ احساس بیدار ہونا چاہیئے کہ مجھے اپنے علاج کی فکر کرنی چاہیے تیسرا مرحلہ معالج کی تلاش کا ہوگا، علمائے ربانی کی حیثیت معالج کی ہے۔ مگر جیسا کہ دیکھا گیا ہے کوئی چیز جتنی قیمتی ہوتی ہے اس کی نقل تیار ہونے کا زیادہ امکان ہوتا ہے اور جعل سازوں کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے اس لئے اس مقام پر نقلی اور اصلی معالج میں تمیز کرنے کا سلیقہ بھی آنا چاہیئے۔ جہاں علمائے ربانی سے دُنیا خالی نہیں وہاں علمائے سوء یعنی نقالوں کی بھی کثرت ہے۔ مگر نقلی کرنسی کو دیکھ کر اصلی سے بھی اعتماد اُٹھ جانا، اور سرے سے کرنسی کا ہی انکار کر دینا اپنی روزمرہ زندگی کو دوبھر بنا دینا ہے رہا یہ سوال کہ ان کی پہچان کیا ہے تو اس معاملے میں بھی عامی کو وہی رویہ اختیار کرنا چاہیئے جو جسمانی امراض کے علاج میں مروج ہے کہ یہ دیکھے اس عالم کے پاس بیٹھنے والوں کی سیرت میں کوئی خوش گوار تبدیلی آتی ہے یا نہیں۔ اس کے شاگردوں میں دنیوی لذّات میں محویت کا جنون سوار ہے یا فکرِ آخرت ان کی عملی زندگی میں غالب نظر آتا ہے۔ اس کی مجلس میں بیٹھنے سے اللہ کی طرف دل کا رجوع ہو جاتا ہے یا نہیں، جہاں یہ باتیں پائی جائیں ایک عامی کو پورے اعتماد سے اللہ کے بھروسے پر ایسے عالم سے دین سیکھنا چاہیئے۔

یہ سوال اکثر ان ذہنوں میں اُبھرتا ہے جن کو دین کی اہمیت کا احساس نہیں ہوتا مسلمان گھروں میں پیدا ہو جانے کے حادثہ کا شکار ہو چکے ہوتے ہیں دین سے عملاً جان چھڑانے کا بہانہ تلاش کرتے ہیں اور یہ بظاہر معقول بہانہ بن جاتا ہے کہ ہم کہاں جائیں یہ فلسفے سمجھ میں نہیں آتا کہ "جب علماء میں اختلاف پایا جاتا ہے تو دین سے ہی دست بردار ہو جانا چاہیئے" بھلا یہ بھی عقل کا فیصلہ کہلا سکتا ہے۔

سوال ۱۳: دیوبندی اور بریلوی میں کیا فرق ہے۔ ان میں باہمی دشمنی کی حد تک اختلاف کیوں پایا جاتا ہے۔

جواب : ہر چیز کی دو حالتیں ہو سکتی ہیں ایک صورتِ شے اور دوسری حقیقتِ شے۔ اختلاف کی بھی دو شکلیں ہیں۔ ایک صورتِ اختلاف، دوسرا حقیقت اختلاف اگر اصول میں اتفاق و اتحاد ہو مگر تعبیر یا طریق کار میں رائے مختلف ہو جائیں تو یہ حقیقی اختلاف نہیں ہوتا۔ غالباً اسی قسم کے اختلاف کو رحمت کہا گیا ہے ہاں اگر اصول میں اختلاف ہو جائے تو معاملہ کی صورت بدل جاتی ہے۔ اس اصول کی روشنی میں ہم دیوبندی اور بریلوی مکتب فکر کا جائزہ لیں تو یہ صورت سامنے آتی ہے۔

عقائد یا اجزائے ایمان :

(ا) سرفہرست عقیدہ توحید ہے دونوں فریق توحید کے قائل ہیں۔
ذات باری اور صفات باری میں کسی کو اللہ تعالیٰ کا شریک تسلیم نہیں کرتے۔

(ب) رسالت : اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو انبیاء وقتاً فوقتاً مبعوث ہوتے رہے سب کو برحق سمجھتے ہیں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دونوں فریق آخری نبی اور واجب الایمان اور واجب الاتباع سمجھتے ہیں۔

(ج) معاد۔ دونوں فریق حیات بعد موت۔ برزخ کی زندگی قیام قیامت۔ حشر نشر، وزن اعمال، جنت دوزخ سب چیزوں پر ایمان رکھتے ہیں۔

(د) الہامی کتب : دونوں فریق ان سب کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں جو اللہ کی طرف سے انبیاء پر نازل ہوئیں اور قرآن مجید کو آخری آسمانی کتاب تسلیم کرتے ہیں اور اسے واجب الاطاعت بھی مانتے ہیں

(س) ملائکہ : دونوں فریق ایمان رکھتے ہیں کہ ملائکہ مستقل مخلوق ہے اور انکی خاصیت یہ ہے کہ لَا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَا اَمَرَھُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ۔

ایمان کے بعد دین کا دوسرا جز عمل صالح ہے تو اس سلسلے میں :-

(ا) دونوں فریق لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ کے اقرار اور تصدیق قلبی کو لازمی قرار دیتے ہیں کسی نے بھی اس کلمہ میں نہ کمی کی ہے نہ اضافہ کیا ہے۔

(ب) **نماز** : دونوں پانچ وقت کی نماز کو فرض سمجھتے ہیں اور اسی طریقہ سے اور اتنی رکعات پڑھنے کے قائل ہیں جو نبی کریمؐ سے تواتر سے ثابت ہے۔ نہ کسی سے تین نمازیں اختیار کی ہیں نہ چھ فرض قرار دی ہیں۔

(ج) **روزہ** : دونوں فریق رمضان کے مہینے میں روزے رکھنا فرض سمجھتے ہیں۔ کسی نے نہ مہینہ بدلا ہے نہ دنوں کی تعداد میں کمی بیشی کی ہے۔

(د) **زکوٰۃ** : دونوں فریق حولان حول کی شرط کے ساتھ صاحب نصاب پر ۲½ فی صد زکوٰۃ ضروری سمجھتے ہیں۔

(س) **حج** : دونوں فریق اس امر کے قائل ہیں اور اس پر ان کا عمل ہے کہ صاحب استطاعت کو عمر بھر میں کم از کم ایک مرتبہ مقررہ وقت پر حج بیت اللہ کرنا ضروری ہے۔ اور روضۂ اطہر کی زیارت کو حج کی تکمیل کے لئے ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ جس نے حج کیا مگر میری ملاقات کے لئے نہ آیا اس نے مجھ پر جفا کی۔ (اوکما قالؐ)

اِس تفصیل سے ظاہر ہے کہ اجزائے ایمان اور ارکان اسلام میں دونوں فریق متحد ہیں ان میں کوئی اختلاف نہیں، اور دونوں کے نصاب تعلیم میں ایک ہی نام کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں عقائد میں شرح عقائد نسفی دونوں کے ہاں بنیادی حیثیت رکھتی ہے تفسیر حدیث فقہ میں اِدھر بھی وہی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں جو ادھر داخل نصاب ہیں۔ وہی قرآن اُدھر بھی پڑھایا جاتا ہے اور اِدھر بھی، اسی قرآن کی ایک ہی تفسیریں دونوں کے نصاب تعلیم داخل ہیں۔ شعبۂ حدیث میں دونوں طرف صحاح ستہ کی تعلیم دی جاتی ہے فقہی مسلک کے لحاظ سے دونوں مقلد ہیں اور امام ابوحنیفہؒ کی تقلید کرتے ہیں اِس لئے فقہ

حنفی کی وہی کتابیں ایک کے ہاں پڑھائی جاتی ہیں جو دوسرے طبقہ کے ہاں داخلِ نصاب ہیں جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اصول میں دونوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں زیادہ سے زیادہ اصولوں کی تعبیر میں آراء مختلف ہو سکتی ہیں۔ اگر دونوں کے نصابِ تعلیم میں قرآن مختلف ہوتے۔ احادیث کی کتابیں صحاح ستہ کی جگہ اسفار اربعہ ہوتیں۔ فقہ میں ایک طرف قدوری، ھدایہ، کنز شرح وقایہ کی تعلیم دی جاتی دوسری طرف تہذیب الاحکام اور من لایحضرہ الفقیہہ پڑھائی جاتی تو اسے اصولی اختلاف کہا جاسکتا تھا۔ اس تعبیری اختلاف کی صورت تو کچھ یوں بنتی ہے جیسے تعزیرات پاکستان یا ضابطہ فوجداری کی کسی دفعہ کی تعبیر ایک وکیل کچھ کرتا ہے، دوسرا کچھ اور کرتا ہے۔ مگر اس بنا پر کسی کو نہ غدار پاکستان کہا جاتا ہے نہ دستور پاکستان کا منکر، نہ اس سے پاکستانی شہری ہونے کا حق چھین لیا جاتا ہے۔

اگر تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ مخالفت یا دشمنی کی قسم کا اختلاف زمانہ حال ہی میں وجود میں آیا ہے۔ تقسیم ملک کے بعد یہ کاروبار تھوک کی بنیاد پر شروع کیا گیا اور اسے چمکایا گیا۔ ممکن ہے اس میں لادین سیاست کو دخل ہو جس میں جذبات کو مشتعل کرنے کے لیے کوئی بہانہ درکار ہوتا ہے۔ اور اس سستی جذباتیت سے عوام کو زیادہ سے زیادہ ایکسپلائٹ کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ یا اس کی وجہ کوئی معاشی ہو، بہرحال اس دشمنی کی بنیاد کسی دینی جذبے پر ہرگز نہیں۔

ماضی قریب میں ہم دیکھتے ہیں کہ دیوبندی اور بریلوی کے الفاظ محض کسی کتاب میں یا علماء کے مخصوص حلقوں میں سنائی دیتے تھے۔ عوام تو ان الفاظ سے ناآشنا تھے۔ اور جن حلقوں میں یہ الفاظ استعمال ہوتے تھے ان کی حیثیت بھی کچھ اسی قسم کی تھی جیسے کسی نے علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی تو علیگ کہلایا، اسی طرح جس نے دیوبند کے مدرسہ میں تعلیم پائی اسے دیوبندی کہہ دیا، جس نے بریلی کے مدرسہ

سے سند حاصل کی اسے بریلوی کہہ دیا۔

جہاں تک علمی یا تعبیری اختلاف کا تعلق ہے وہ صرف علماء تک محدود تھا، مگر ان میں مخالفت یا دشمنی نہیں تھی۔ اور دونوں مدارس کے علماء کو احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے مثال کے طور پر حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ جہاں علمائے دیوبند کے شیخ طریقت ہیں وہاں ان حضرات کے ہاں بھی اسی احترام سے دیکھے جاتے ہیں جن کو لوگ بریلوی سمجھتے ہیں۔ مثلاً مکہ مکرمہ میں حضرت حاجی صاحبؒ اور حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی کی ملاقاتیں باہمی مذاکرے، علمی صحبتیں۔ اخذ فیض اور اخذ نسبت کے واقعات کس سے مخفی ہیں۔ کہاں وہ باہمی محبت و مروت کے مناظر، کہاں آج کی تو تو میں میں۔ تو اس عظیم تبدیلی کی وجہ سطحی علم یا اتباع ھوٰی کے بغیر کوئی اور معلوم نہیں ہوتی۔ پھر سیاسی ذہن کے نام نہاد مذہبی پیشواؤں نے اس جذبے کی سرپرستی اس جذباتی طریقے سے کی کہ مخالفت بڑھتی ہی چلی گئی یہاں تک کہ کشت و خون تک نوبت پہنچ گئی۔

اس ناروا تبدیلی کی ایک وجہ حافظ ابن عبدالبرؒ نے اپنی مشہور کتاب جامع بیان العلم میں بیان کی ہے۔ لکھتے ہیں۔ "حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں۔

لا یزال الناس بخیر ما اتاھم العلم من قبل اکابرھم فاذا اتاھم من قبل اصاغرھم ھلکوا۔ (جامع بیان العلم ۲: ۳۲)

"یعنی جب تک لوگ متقدمین علماء کے علم سے اخذ فیض کرتے رہیں گے امن اور ترقی سے دوچار ہوں گے جب اصاغر یعنی نام نہاد علماء کا علم رائج ہوگا تو لوگ تباہ ہو جائیں گے۔"

عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں کہ "اصاغر سے مراد وہ لوگ ہیں جو دین میں اپنی رائے لڑائیں۔"

علمائے ربانی کے باہمی علمی یا تعبیری اختلاف کی مثال یوں سمجھیے کہ مشن کورٹ

کسی مجرم کو سزائے موت سنا دیتی ہے۔ ہائی کورٹ میں اپیل ہوتی ہے تو اسے بری کر دیا جاتا ہے۔ اب کوئی بتائے کہ کیا دونوں عدالتوں میں مختلف قانون رائج ہیں یا مختلف ضابطہ فوجداری چلتا ہے۔ اگر ضابطہ اور قانون دونوں عدالتوں میں ایک ہی ہے تو اُسے ایک ہی قانون کی مختلف تعبیروں کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے۔ ایسے واقعات روزمرہ دیکھنے میں آتے ہیں مگر اس اختلاف کی وجہ سے نہ تو سیشن جج کو دیس نکالا دیا جاتا ہے نہ ہائیکورٹ کے ججوں کو باغی یا غدار قرار دیا جاتا ہے۔ بلکہ دونوں کو فرض شناس قرار دے کر ہائی کورٹ کے فیصلہ پر عمل ہوتا ہے۔

یہاں یہ بات پیشِ نظر رہے کہ وکیل اور جج میں جو فرق ہے اس سے ہر کہ دمہ واقف ہے یعنی وکیل زیادہ سے زیادہ یہ بتا سکتا ہے کہ اس معاملہ کی قانونی صورت یہ ہے مگر وکیل فیصلہ نہیں سُنا سکتا یہ کام صرف جج کا ہے آج تک کسی وکیل نے یہ حرکت نہیں کی کہ اپنے کسی مؤکل کو خود ہی فیصلہ سُنا دے مگر ہماری بدنصیبی کا یہ عالم ہے کہ دین کے معاملے میں ہر لال بجھکڑ اپنے آپ کو مجتہد ہی سمجھتا ہے اور بڑی دلیری سے ہر اس شخص کے متعلق فتوے دے دیتا ہے کہ تو کافر ہے جو اس کی رائے سے اختلاف کرتا ہے۔ سچ کہا کسی نے کہ "اگر نااہل خاموش ہو جائیں تو جھگڑے ختم ہو جائیں۔"

غرض اصول دین میں اتنا کامل اتفاق ایک طرف اور عملاً باہمی جانی دشمنی کا مظاہرہ دوسری طرف ایک معمہ ہے جو کسی طرح حل نہیں ہو سکتا۔ اِس عظیم تضاد کی وجہ معلوم کرنے کے لیے اگر حالات کا جائزہ لیا جائے تو حقیقت اُبھر کر سامنے آجاتی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے:—

دونوں طرف دو قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ جو انتہا پسند ہیں۔ ان میں تشدد کہیئے یا تعصب یا ضد کچھ ایسی بیماریاں موجود ہیں۔ اور یہ ساری آگ انہی لوگوں کی لگائی ہوئی ہے۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو اعتدال پسند وسیع النظر اور تمام امور کے روشن پہلوؤں

پر زیادہ توجہ دینے والے لوگ ہیں یہ طبقہ رحماء بینھُم کے باقیات الصالحات کہلائے جا سکتے ہیں۔

یہ قدرتی بات ہے کہ خواہ تشدد اور تعصب ہی ہو اس کے لئے کوئی بنیاد ضروری ہے۔ چنانچہ ایک مسئلہ ایسا ہے کہ ہر دو جانب کے متشددین کو اس میں کھل کھیلنے کا وسیع میدان مل جاتا ہے۔ اور وُہ مسئلہ ہے محبت رسُولؐ کا۔ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ لَایُؤمن احدکم حتی اکون احب اِلَیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین او کما قال ۔۔۔۔ محبت قلب کا فعل ہے اور قلب کی حالت وہی جانتا ہے جو علیم بذات الصدور ہے اور محبت ایک قوت ہے اور ہر قوت اظہار کا مطالبہ کرتی ہے لہذا محبت بھی ظاہر ہوئے بغیر رہ نہیں سکتی۔ کبھی تو محبت میں ضبط اتنا ہوتا ہے کہ آدمی کہہ اُٹھتا ہے۔ ؎

باچنیں زدرجنوں پاس گریباں داشتم
درجنوں از خود نہ رفتن کار ہر دیوانہ نیست

اور کبھی معاملہ ضبط سے گذر جاتا ہے مگر احتیاط پھر بھی رہتی ہے بقول شخصے ؎

ضبط کہتے ہیں اسے آئیں نہ لب تک نالے
چیر کر سینہ کو نکلیں تو نکل جانے دو۔

اور کبھی احتیاط کا دامن بھی چھوٹ جاتا ہے۔ اور آدمی از خود رفتہ ہو کر وہاں پہنچ جاتا ہے جہاں سے وُہ سرحد شروع ہو جاتی ہے جس پر نامناسب یا غیر موزوں کے الفاظ صادق آتے ہیں یہی وہ حالت ہے جس سے جعلی اور بناوٹی از خود رفتگی یا محبت کے اشتہار کے دِل دادہ لوگ فائدہ اُٹھا کر ان لوگوں کو بھی بدنام کرتے ہیں جو واقعی معذور سمجھے جانے کے لائق ہیں۔

اِن تینوں قسموں میں سے پہلی قسم کے لوگ اور نمونے کے لوگ وہی تھے جن کی

تربیت خود محبوبؐ نے کی یہ لوگ محبت کے سمندر پی گئے بلکہ بحرِ محبت بن گئے مگر کوئی ہلکی سی موج بھی سطح پر نہ ابھرنے دی۔ بلکہ دَرد محبت کے باوجود ان کی حالت یہ تھی کہ

ع دل محیط گریہ کو لب آشنائے خندہ ہے

اور ظاہر ہے محبت اور اظہار محبت کا معیاری طریقہ یہی ہے بعد میں آنے والے لوگوں میں بھی ان جیسی نہ سہی مگر ان سے ملتی جلتی مثالیں ملتی ہیں۔

پھر ایسے لوگ آئے جو ان کے نقش قدم پر چلنے کی انتہائی کوشش کرتے رہے مگر ان جیسا دل گردہ کہاں سے لاتے ضبط میں انتہائی کوشش کے باوجود لاوا پھوٹتا ہی رہا مگر پھر بھی احتیاط کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ جوں جوں زمانہ نبوی سے بُعد ہوتا گیا وہ قوت کم ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ محبت کی گہرائی کم ہوتے ہوتے بات صرف سطحی صورت تک پہنچ گئی اور اسی کا اہتمام ہونے لگا کہ سطح پر بلند ترین موجیں اٹھائی جائیں اور یہ کام اتنی اہمیت اختیار کرتا گیا کہ بحرِ محبت کی گہرائیوں میں اُترنے کا تصور بھی ذہن سے نکل گیا، اور وہ معذور لوگ جو اپنی کم ہمتی کی وجہ سے واقعی معذور تھے وہ بھی جعلی اور بناوٹی خیال کیے جانے لگے۔

اِن حالات میں انتہا پسندوں کی بن آئی۔ اور اُنھوں نے ایک دُوسرے کو خوب لتاڑنا اور رگیدنا شروع کر دیا، دیوبندیوں میں جو لوگ متشدد انتہا پسند یا متعصب کہہ لیجئے اس بات پر اُتر آئے کہ ہر ایک کو مشرک کہنا شروع کر دیا حتیٰ کہ ایسے واقعات بھی سامنے آئے کہ اُنھوں نے خود اپنے اساتذہ اور اکابر کو بھی مشرک کہنے سے دریغ نہ کیا اور اکابر دیوبند نے ہزار جتن کیے کہ وہ کسی طرح معتدل روش اختیار کریں مگر ان کی ایک نہ چلی وہ برابر اسی ڈگر پر چلے جا رہے ہیں

دوسری طرف بریلوی حضرات کے متشددین نے اپنے مقابل کے متشددین کو سامنے رکھ کر تمام دیوبندیوں کو گستاخ رسُول اور وہابی کہنا شروع کیا، مگر پھر بھی لفظ مشرک کے

جواب میں یہ الفاظ پھر بھی نرم تھے اِس لئے انتقام کا حق ادا نہیں ہو سکتا تھا لہذا انھیں کافر کہہ کر جوابی کارروائی شروع کی، عوام کی طبائع چونکہ ہنگامہ پسند واقع ہوئی ہیں گرماگرمی کی شیدا ہوتی ہیں لہذا دونوں طرف سے عوام نے اِن انتہاپسندوں کی قوت میں اضافہ کیا اور یہ خلیج وسیع تر ہوتی چلی گئی۔

اگر آپ ان حضرات کے شوروشغب سے علیحدہ ہوکر دونوں طرف کے اعتدال پسندوں کی کوششوں کا جائزہ لیں تو آپ یہ تسلیم کرنے میں کوئی دقت نہ محسوس کریں گے کہ اِن میں درحقیقت کوئی اختلاف نہیں۔ چند مثالیں پیشِ خدمت ہیں۔

(۱) مسئلہ مولود شریف :

"ہرگاہ یہ مسئلہ اختلافی ہے اور ہر فریق کے پاس دلائل شرعی بھی ہیں گو قوت و ضعف کا فرق ہو جیسا اکثر مسائل اختلافیہ میں ہُوا کرتا ہے پس خواص کو تو چاہیئے کہ جو ان کو تحقیق ہوا ہو اس پر عمل رکھیں اور دُوسرے فریق کے ساتھ بغض و کینہ نہ رکھیں نہ نفرت و تحقیر کی نگاہ سے اس کو دیکھیں نہ تفسیق و تذلیل کریں بلکہ اس اختلاف کو مثل اختلاف حنفی و شافعی کے سمجھیں اور باہم ملاقات و مکاتبت و سلام و موافقت و محبت کی رسوم جاری رکھیں اور تردید و مباحثہ سے خصوصاً بازاریوں کی ہذیانات سے کہ متعصب اہلِ علم کے خلاف ہے پرہیز رکھیں بلکہ ایسے مسائل میں نہ فتوے لکھیں نہ مہر دستخط کریں کہ فضول ہے اور ایک دوسرے کی رعایت رکھیں ......" (حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رح)

(۲) "مشرب فقیر کا اس امر میں یہ ہے کہ ہر سال اپنے پیر و مرشد کی رُوح مُبارک کو ایصال ثواب کرتا ہوں۔ اوّل قرآن خوانی ہوتی ہے، اور گاہ گاہ اگر وقت میں وسعت ہُوئی تو مولود پڑھا جاتا ہے پھر ماحضر کھانا کھلایا جاتا ہے اور اس کا ثواب بخش دیا جاتا ہے اور زوائد امور فقیر کی عادت نہیں نہ کبھی سماع کا اتفاق ہُوا نہ خالی نہ بآلات، مگر دل سے اہل حال پر کبھی اعتراض نہ کیا، ہاں جو محض ریاکار و مدعی ہو وہ بُرا ہے مگر تعیین اس کی کہ

فلاں شخص ریاکار ہے بلا حجت شرعیہ نادرست ہے۔ اس میں بھی عمل در آمد فریقین کا یہی ہونا چاہیئے۔" (ایضاً)

(۴) ندا — ندا سے مقاصد و اغراض مختلف ہوتے ہیں کبھی محض اظہارِ شوق کبھی تحسر کبھی منادی کو سُنانا کبھی اس کو پیغام پہنچانا، سو مخلوق غائب کو پکارنا، اگر محض تذکرہ اور شوقِ وصال اور حسرت و فراق کے لئے ہے جیسے عاشق اپنے محبوب کا نام لیا کرتے ہیں اور اپنے دِل کو تسلّی دیا کرتے ہیں اس میں تو کوئی گناہ نہیں ...... ایسی ندا صحابہؓ سے بکثرت روایات میں منقول ہے۔ کما لا تخفیٰ علی المتبحر المتسع النظر... اگر مخاطب کا اسماع و سنانا مقصود ہے تو اگر تصفیہ باطن سے منادی کا مشاہدہ کر رہا ہے تو بھی جائز ہے اور اگر مشاہدہ نہیں کرتا لیکن سمجھتا ہے کہ فلاں ذریعہ سے اس کو خبر پہنچ جائے گی اور وہ ذریعہ ثابت بالدلیل ہو تب بھی جائز ہے مثلاً ملائکہ کا درود شریف حضور اقدسؐ میں پہنچانا احادیث سے ثابت ہے اس اعتقاد سے کوئی شخص الصّلوٰۃ والسّلام علیک یا رسُول اللہ کہے کچھ مضائقہ نہیں اور اگر نہ مشہور ہو نہ پیغام پہنچانا مقصود ہو نہ پیغام پہنچانے کا کوئی ذریعہ دلیل سے موجود ہو وہ ندا ممنوع ہے۔" (حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ)

آخر میں حضرت حاجی صاحب کی وصیت درج کی جاتی ہے۔

"اس تمام تحقیق کے بعد بھی فقیر کی یہ وصیت ہے کہ ظنیات میں اپنے علم و تحقیق پہ وثوق نہ کریں۔ سُورہ فاتحہ میں اھدنا الصراط المُستقیم بہت خشوع سے پڑھا کریں اور ہر نماز کے بعد ربنا لا تزغ قلوبنا الخ پڑھ کر دُعا کیا کریں اور اپنے اوقات معاش و معاد کے ضروری کاموں میں خصوصاً تزکیۂ نفس اور تصفیہ باطن صرف کریں، اور اہل اللہ کی صحبت و خدمت اختیار کریں۔"

دُوسری طرف حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی کے چند ملفوظات پیشِ خدمت ہیں

(۱) **مزامیر** ـــــ در ایام عرس شخصے حاضر آمد کہ نزدش چنگ بود وبزرگ زادہ کہ حضرت را رعایتش منظور بود آں مطرب را اشارہ کرد حضرت آنرا منع فرمودند کہ اگر رضائے ما خواہی ہرگز برایں امر راضی نیم زیرا کہ ما و طریق مرضیہ مرشد خویش خواجہ شمس الدین سیالوی ہرگز نہ گزاریم وایشاں ایں کا نہ کردہ اند (ملفوظات طیبہ)

(۲) **سوال :** آیا مالیدن رخسارہ وسجدہ در پیش مزارات وطواف حوالی ایشاں جائز است یا نہ ؟

فرمودند ظاہر شرع مجیز ایں امور نیست و ما بچہ طور فتوی دہیم آں شخص عرض کرد شنیدم کہ از خواجہ سیالوی اجازت ایشاں ثابت است ، فرمودند ایشاں پیر و مرشد ما بود از حال شمس سیالوی بہ نسبت شما مردماں زیادہ واقف ہستم و باید دانست کہ ہر چہ حق تعالیٰ فرمودہ است رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیان فرمودہ از برائے ما شرع است وبروئے اعتقاد محکم باید داشت ۔ (ایضاً)

(۳) **ذکر جہر :** اگر بمطابق قواعد کہ مشائخ بیان فرمودہ اند ذکر کردہ مؤثر مے باشد والا محض جہر آب در غربال است ۔ (ایضاً)

(۴) ایک مسئلہ سماع بہ آلات کا ہے ۔ سچ تو یہ ہے کہ میں بذاتِ خود اِس امر سے نہایت تنگ دِل ہوتا ہوں (ملفوظات)

(۵) شوقیہ اشعار کا تخلیہ میں مطالعہ کرنا مزامیر وغیرہ کے سماع سے بہتر ہے ۔ (ایضاً)

(۶) عمدہ ترین مسلک اور پسندیدہ ترین مشرب میرے نزدیک یہ ہے کہ

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنہ (ایضاً)

(۷) ایک شخص نے عرض کیا جہاں درود شریف پڑھا جائے کیا وہاں رُوحِ محمدی تشریف فرما ہوتی ہے حضور قدس سرہٗ نے فرمایا رُوحِ مبارک کا تشریف لانا اس طرح سمجھنا چاہیئے کہ جیسے سُورج اپنی جگہ پر قائم ہے لیکن اس کی روشنی ہر جگہ موجود ہے رُوحانی سفر میں قرب و بعد عنصری نہیں ہوتا۔ (ایضاً)

(۸) ایک روز ایک شخص نے نماز عصر کے بعد مولود خوانی شروع کی آپ سنتے رہے تھوڑی دیر بعد اس نے راگ کی طرز پر مولود خوانی شروع کی اس پر آپ نے اس کو روک دیا اور فرمایا ہے تو یہ بھی مولود شریف مگر چونکہ راگ کی طرز پر ہے اس لیے خلاف شان مسجد ہے۔ (ایضاً)

(۹) حب عباد اللہ الصالحین اللہ تعالےٰ کے قرب کا ایک اعلیٰ ذریعہ ہے لیکن اس میں بھی تجاوز کیا جائے جیسے ان صلحاء کو معبود بنالیا جائے یا ان کو متصرّف مستقل سمجھا جائے یا شریک فی التصرف اس طرح سے کہ اللہ تعالیٰ بغیر ان کی شرکت کے انتظام عالم نہیں کر سکتا تو یہی حب موجب شرک ہو جائے گی اور وہی محب، مشرک ناقابل مغفرت ہو جائے گا۔ لہذا انسان کو کبھی اعتدال کا راستہ نہیں چھوڑنا چاہیئے حب اہل بیت و حب عباد اللہ الصالحین صاحب اعتدال کے لئے نہایت مفید و موجب کمال ہے۔ مگر ان میں افراد و تفریط و غلو کرنے والے گمراہی اور ضلالت کا راستہ اختیار کر لیتے ہیں ؎ (مہر منیر ۵۶۵)

(۱۰) ایک اور مسئلہ جس کو طرفین کے تشدد پسند حضرات بنائے فساد بنائے بیٹھے ہیں کس خوش اسلوبی سے بیان فرمایا ہے۔

"مخدوما! اس میں شک نہیں کہ اہل ایمان کے لئے ذکر آل حضرتؐ بطریق تکریم واجب اور ضروری ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ لفظ بشر کے معنی بحسب لغت

عربیہ عظمت وکمال پایا جاتا ہے یا حقارت ؛ میری ناقص رائے میں لفظ بشر مفہوماً ومصداقاً متضمن بہ کمال ہے مگر چونکہ اس کمال تک ہر کس وناکس سوائے اہل تحقیق اور عرفان کے رسائی نہیں رکھتا لہذا لفظ بشر میں خواص بلکہ اخص الخواص کا حکم عوام سے علیحدہ ہے۔ خواص کے لیے جائز اور عوام کے لئے بغیر زیادت لفظ دال بر تعظیم ناجائز ؛ (مہر منیر ۴۵۴)

یہ ایک حقیقت ہے کہ عام آدمی جب بشر کا لفظ بولتا ہے تو اس کی نگاہ اپنی ذات پر پڑتی ہے۔ اور خلقت کے اعتبار سے اس کے بشر ہونے کا کون انکار کر سکتا ہے۔ مگر جب اپنے اوصاف کو دیکھتا ہے تو اس کے ذہن میں بشر کا وہ مفہوم کیسے آسکتا ہے جو متضمن بہ کمال ہے لہذا اصل اختلاف لفظ بشر کے متعلق نہیں ہوتا بلکہ اس مفہوم کی وجہ سے ہوتا ہے جو دونوں کے ذہنوں میں جدا جدا ہے۔ اگر دونوں کی ذہنی سطح یکساں ہو تو اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

حضرت گولڑوی کا ایک ملفوظ اور آپ کا مسلک :

"فرمایا اہل اسلام کی تکفیر میں بلا وجہ زبان نہ کھولنی چاہیئے یہ بہت ہی ناپسندیدہ امر ہے کیونکہ کفر آخری حد کا نام ہے کہ اس کے بعد کوئی مقام خدا سے دوری کا نہیں ہوتا، لہذا تکفیر کا فتوے دینے میں کافی تامل کرنا چاہیئے۔ (ملفوظات مہریہ

آپ کا مسلک : مترجم کہتا ہے اس بارے میں حضرت قدس سرہٗ کا مسلک نہایت محتاط رہا ہے۔

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی رح کے چند ملفوظات بطور مثال کے پیش کئے گئے۔ یہ اجمالی بیان دو اشخاص کے خیالات نہیں بلکہ یہ دونوں جماعتوں کے اعتدال پسند طبقہ کی نمایندگی کر رہے ہیں، اس لئے یہ یقین کر لینے میں کوئی چیز مانع نہیں کہ اگر غلو، انتہا پسندی اور تشدد کی روش اختیار نہ کی جائے تو

دیوبندی اور بریلوی مسلک میں کوئی فرق نہیں۔

یہ امر پیشِ نظر رہے کہ ان حضرات کی یہ ذاتی رائے نہیں بلکہ قرآن و سنت سے جس معتدل رویہ کا نشان ملتا ہے ان حضرات نے وہی روش اختیار کی ہے۔ قرآن کریم نے اس امت کو امتہ وسطاً قرار دیا ہے کہ یہود و نصاریٰ اور دوسری گم کردہ راہ اقوام کی طرح یہ امت افراط و تفریط کا شکار نہیں ہو سکتی بلکہ اسے ہمیشہ اعتدال کی راہ پر گامزن ہونا چاہیئے۔ ان حضرات کے سامنے یہ حقیقت موجود تھی کہ فلا وربک لا یؤمنون الخ یعنی حضور اکرمؐ کے احکام کے متعلق دل کی گہرائیوں میں بھی ناپسندیدگی کا نشان نہ ملے۔ اور یہ صورت صرف اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب مومن کے دل میں انتہائی درجے کی محبت کا جذبہ موجود ہو۔ پھر صاف حکم کہ تعزروہ و توقروہ۔ اس بات کا متقاضی ہے کہ حضورؐ سے محبت کرنا ایک اہم فریضہ ہے

دوسری طرف حضورؐ کا یہ انتباہ کہ میرے ساتھ محبت کے معاملے میں نصاریٰ کی طرح غلو کا شکار نہ ہو جانا، دراصل اعتدال کی راہ اختیار کرنے کا حکم ہے، ظاہر ہے کہ راہِ اعتدال پہ قائم رہنے کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ عقائد ہوں یا عبادات، اخلاق ہوں یا معاملات ہر بات میں حضورؐ کا اسوہ اور حضورؐ کے اقوال و ارشادات کو سامنے رکھا جائے اور اس راہ سے ہٹنے کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ انسان اپنی پسند کو دخل دینے لگے اور حضورؐ کے بتائے ہوئے طریقے میں من پسند اضافے یا کمی کرنے لگے۔ حضورؐ نے اس خطرے سے آگاہ ہی نہیں فرمایا بلکہ اس سے بچنے کی تاکید فرمائی مثلاً :-

(۱) اللہ تعالیٰ نے بدعتی کے عمل کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے تاوقتیکہ وہ اپنی بدعت کو ترک نہ کر دے۔ (ابن ماجہ)

(۲) جس شخص نے کسی بدعتی کی تعظیم و توقیر کی اس نے اسلام کے مٹانے میں اس کی مدد اور اعانت کی ؛ (مشکوٰۃ)

(۳) بدعتی اسے کہتے ہیں جس نے کسی ایسے کام پر مواظبت کی جو شارع نے نہیں کیا۔ (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ۱: ۴۱)

پھر ان حضرات کے سامنے علمائے ربانی کی مثال بھی موجود تھی جو نہ صرف اِس اعتدال کی راہ پر چلتے رہے بلکہ انھوں نے ایک دُنیا کو اس پر چلایا مثلاً حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضور اکرمؐ کی پیروی کرتے ہوئے اس خطرے سے بچنے کی بار بار تاکید فرمائی۔ مثلاً

(۱) ہر بدعت، سُنّت کو دُور کرنے والی ہے خواہ حسنہ ہو یا سیئہ (مکتوبات امام ربانی ۱: ۱۸۶)

(۲) سُنّت اور بدعت دونوں پُوری طرح ایک دُوسری کی ضد ہیں، ایک کی بقا دوسری کی فنا کو لازم ہے۔ (ایضاً ۱: ۲۵۵)

(۳) بدعت کا جاری کرنا دین کی بربادی کا موجب ہے۔ خدائے تعالیٰ علمائے وقت کو توفیق دے کہ بدعت کو حسنہ کہنے کی جرأت نہ کریں۔

(۴) احکام شرعی کی بجاآوری نفس پر سب باتوں سے زیادہ دشوار ہے۔ سُنّت کی تقلید کے علاوہ عبادتیں معتبر نہیں۔ (ایضاً ۱: ۲۲۱)

(۵) اگر کوئی بات سنت اور بدعت کے درمیان پڑتی ہو تو اسے سُنّت سمجھ کے پُورا کرنے کی نسبت بدعت سمجھ کر ترک کر دینا بہتر ہے۔ (ایضاً ۱: ۳۱۳)

(۶) میں نہایت عاجزی سے اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا ہوں کہ دین میں جو نئی چیز پیدا کی گئی ہو۔ جو بدعت کھڑی کی گئی ہو۔ جو حضور اکرمؐ اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں دین میں نہیں تھی اگرچہ وہ روز روشن کی طرح چمک دار ہو اس عاجز کو اس پر عمل کرنے سے بچائے اور حضور سید المرسلین کے صدقے مجھے اس کے ظاہری حسن پر فریفتہ ہونے سے بچائے۔ (ایضاً ۳: ۱۸۶)

(۷) چیزے کہ مردود باشد حسن از کجا پیدا کند (ایضاً ۳ : ۷۲)

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے فرمایا

"جس نے اسلام میں کوئی بدعت نکالی جس کو وہ حسنہ سمجھتا ہے تو گویا اس نے یہ گمان کیا کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ادائیگی رسالت میں خیانت کی، کیونکہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:

"آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے"

(کتاب الاعتصام شاطبی ۱ : ۴۷)

اسی آیت کے متعلق امام ربانی فرماتے ہیں:

"دین کا کمال ان بدعات سے تلاش کرنا درحقیقت اس آیت کریمہ (الیوم اکملت الخ) کے مضمون سے انکار کرنے کے مترادف ہے

(مکتوبات ۴ : ۲۶۰)

معلوم ہوتا ہے کہ دیوبندی اور بریلوی مکتب فکر کے اعتدال پسند حضرات نے قرآن و سنت کی تعلیمات اور سلف صالحین کی روش کو سامنے رکھ کر راہ اعتدال پر چلنا پسند کیا۔ رہے متشدد دین اور انتہا پسند لوگ تو انھیں معذور سمجھنا چاہیے اور ان کے قول و فعل کو حجت نہیں قرار دینا چاہیے۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ دیوبندی اور بریلوی حضرات میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں، اجزائے ایمان میں دونوں متحد ہیں اعمال صالحہ میں دونوں متفق ہیں۔ صرف ایک جذبہ جس کا تعلق قلب سے ہے بس اس کی تعبیر اور اس کے اظہار کے طریقہ میں ذرا سا اختلاف مگر وہ بھی افتاد طبع کی بنا پر ہے اور وہ ایسا بھی نہیں کہ اختلاف اختلاف نہیں رہے بلکہ مخالفت اور دشمنی کی صورت اختیار کر لے، بہرحال جو صورت حال اس وقت سامنے آرہی ہے اور جس کی شدت میں اضافہ ہی ہو رہا ہے اس کے وجود

سے انکار نہیں کیا جاسکتا مگر اس کی جڑوں کا کھوج لگانے کے لیے علمی تحقیق شاید کوئی خاص کام نہ دے کیونکہ اس کی وجہ علمی نہیں بلکہ قلبی سرد مہری ہے اور اس کا علاج مقلب القلوب کے پاس ہی ہے۔

یہ سوال بھی کوئی کم اہمیت نہیں رکھتا کہ اس کی وجہ کیا ہے اور یہ قلبی سرد مہری کیوں ہے لیکن اس سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ اس اختلاف کے اثرات ملت پر اور خود اسلام پر کس نوعیت کے ہیں۔

ملت کی اس بدنصیبی کا جائزہ لینے کے لئے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں :-

(۱) فریقین کے اکابر علماء اور سربرآوردہ حضرات کی علمی اور عملی صلاحیتیں بس اسی کھپ رہی ہیں کہ کس طرح فریق ثانی کو استدلال کے میدان میں لتاڑا جائے اور عملی زندگی میں کیونکر ان کی تحقیر و تذلیل کی جائے حالانکہ ان حضرات کی یہ صلاحیتیں تعمیری اور اصلاحی کاموں میں صرف ہوتیں تو حالات ہی بدل جاتے ہیں

(۲) فریقین کے لیڈروں کی ساری توجہ اس وقت ایک الیکشن سٹنٹ کی صورت میں اسے استعمال کرنے پر صرف ہو رہی ہے اور ایک دوسرے پر یوں کیچڑ اچھالا جارہا ہے کہ الامان والحفیظ۔ حالانکہ دین کو اس طرح ایکسپلائٹ کرنے سے خسر الدنیا و الاخرہ کا قوی امکان ہے۔

(۳) عوام کے جذبات کو ابھار کر شرافت سے بے نیاز ہو کر دھاندلی کے لئے عملاً تیار کیا جارہا ہے اور حضورؐ کی حدیث المسلم من سلم المسلمون من لسانہ و یدہ گویا ذخیرۂ احادیث سے کھرچ دی گئی ہے

(۴) اسلام دشمن قوتیں ملک کے اندر اور باہر منظم ہو کر جلتی پر تیل نہیں بلکہ پٹرول کا فریضہ انجام دینے میں کوشاں ہیں۔

(۵) منافق قسم کے مسلمان اسلام کو ہدف ملامت بنانے کے لئے بہانے تلاش

کرتے رہتے ہیں انہیں موقع مل گیا کہ وہ علماء کو سامنے رکھ کر دین کو ناقص بیکار اور ناقابلِ عمل ثابت کرنے میں آسانی محسوس کرنے لگے ہیں۔ اس لئے خطرہ ہے کہ مستقبل قریب میں کہ ساری فضا اِس گونج سے بھر جائے کہ :-

۶- ہائے ان مالیوں نے باغ اجاڑا اپنا

اِس لئے فریقین کے علماء سے بالخصوص لیڈروں اور عوام سے بالعموم بڑے ادب سے گذارش ہے کہ ٹھنڈے دِل سے حالات کا جائزہ لیں اپنے رویے پر نظرثانی کریں آخرت کی فکر کریں قوم اور اسلام پر رحم کریں ورنہ اندیشہ ہے کہ سقوط بغداد کا منظر نہ دیکھنا پڑے ؛

سوال ۱۴ : جہاں درود و سلام پڑھا جاتا ہے وہاں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے ہیں تو لوگ احتراماً کھڑے ہو جاتے ہیں مگر کچھ لوگ اس سے منع کرتے ہیں اور ناجائز بتاتے ہیں اس کی وجہ کیا ہے ؟

الجواب : آنکھیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مشاہدہ کریں اور جسم حضورؐ کے احترام کے لئے نہ اُٹھے تو اس سے بری بدبختی کیا ہو سکتی ہے ؟ یہ صورت پیش آئے اور کوئی تعظیم کرنے سے رد کے تو اس سے بڑھ کر سنگ دلی کا تصور بھی بھلا کیا جا سکتا ہے ؟ لیکن درود شریف پڑھنے والے کے سامنے حضورؐ کا تشریف لانا اگر شریعت کی بات ہو تو لازماً فقہ کی کتابوں میں اس کا ذکر ہوگا اور اگر محض محبت کا معاملہ ہو تو محبت میں مشورہ نہیں ہوا کرتا بلکہ محبوب کی پسند اور محبوب کا حکم پیشِ نظر ہوتا ہے۔

اِس صورت مسئلہ میں کئی امور قابلِ غور ہیں۔

(۱) پہلا سوال یہ ہے کہ آپ کو درود و سلام پڑھنے کا موقع یقیناً ملتا ہوگا، کیا آپ نے کبھی حضورؐ کو اس محفل میں تشریف لاتے دیکھا ہے ؟ اگر کبھی نہیں دیکھا بلکہ

کہنے والوں کی اطلاع پر اعتماد کیا تو کیا آپ نے کبھی کسی کہنے والے سے پوچھا بھی ہے کہ صاحب! آپ نے حضورؐ کی تشریف آوری کا منظر دیکھا ہے اور حضورؐ کی زیارت کی ہے؟ اگر آپ کو کوئی ایسا شخص نہیں ملا تو آپ کس بنا پر فرماتے ہیں کہ اس محفل میں حضورؐ تشریف لاتے ہیں۔

(۲) اگر حضورؐ کی زیارت سر کی آنکھوں سے ہوتی ہے تو اس کی کیا وجہ ہے کہ سب کو نظر نہیں آتے۔ ایسی محفل میں کوئی سارے اہل محفل نابینا تو نہیں ہوتے۔ آنکھ میں بینائی ہو اور حضورؐ نظر نہ آئیں یہ بات کیونکر تسلیم کی جا سکتی ہے؟

(۳) اگر سر کی آنکھوں سے مشاہدہ نہیں ہوتا بلکہ قلب کی آنکھ سے کشفی طور پر مشاہدہ ہوتا ہے تو کیا ایسی محفلوں میں سب اہل کشف ہی بیٹھے ہوتے ہیں؟ اگر نہیں تو کیا کسی نے کسی اہل کشف سے اس تشریف آوری کی کیفیت بھی پوچھی ہے؟

(۴) نماز میں ہر شخص ..... درود و سلام پڑھتا ہے اور درود بھی وہ جسے درود ابراہیمی کہتے ہیں اور جس کی فضیلت کسی سے مخفی نہیں مگر کسی نے نہ تو حضورؐ کو تشریف لاتے دیکھا اور نہ کوئی احتراماً کھڑا ہوا مگر سب بیٹھے ہی رہتے ہیں۔

(۵) چلئے مجھ جیسا گنہگار اس قابل نہ سہی کہ نماز میں درود ابراہیمی عمر بھر پڑھتا رہے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت ہو جائے مگر بڑے بڑے صلحاء و علماء کے ساتھ جمعہ کی نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا سب کو بیٹھے رہتے ہی دیکھا، کیا ایسے جمعوں میں کوئی بھی اس قابل نہیں ہوتا کہ دیکھے

اور اگر ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں تو وہ احتراماً کھڑے کیوں نہیں ہوتے ؟

(۶) اور نمازوں میں تو سلام پھیرنے کے چند لمحوں بعد لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں خواہ سُنتیں پڑھنے کے لیے ہی کھڑے ہوں مگر عیدین کی نمازوں میں درود شریف کے بعد نماز سے فارغ ہو کر خطبہ سُننے کے لیے جم کے بیٹھے رہتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے ؟

(۷) یہ معمہ بھی حل طلب ہے کہ نماز میں درُود و سلام پڑھا جائے تو حضورؐ نہ تشریف لائیں نہ کسی کو زیارت نصیب ہو مگر نماز کے علاوہ درود و سلام پڑھا جائے تو حضورؐ محفل میں تشریف بھی لائیں اور لوگوں کو زیارت بھی ہو نماز سے بڑھ کر با برکت محفل بھی کوئی ہو سکتی ہے۔

(۸) روضۂ اقدس پر حاضری کے وقت ہر سال لاکھوں آدمی مواجہ شریف کے سامنے کھڑے ہو کر درود و سلام پڑھتے ہیں۔ اور وہاں "آنے" کا مسئلہ تو سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا حضورؐ وہاں موجود ہوتے ہیں مگر زائرین کو کیا حضورؐ کی زیارت وہاں ہوتی ہے ؟ اگر وہاں نہیں تو یہاں کیسے ہو جاتی ہے

(۹) نماز کا ہر رکن اور ہر رکن میں مقررہ الفاظ شریعت میں پسندیدہ ترین اور افضل ترین صُورت ہے تو اس کی کیا وجہ ہے کہ نماز میں درُود و سلام کے لیے حالت قعود اللہ و رسُول اللہ کے ہاں پسندیدہ ترین ہو اور نماز کے علاوہ درُود و سلام کے لیے قیام افضل ہو۔ اگر شریعت نے روضۂ اطہر کی حاضری کے علاوہ قیام کی حالت میں ہی افضل قرار دیا ہو تو سر آنکھوں پر۔ اگر فقہ کی کسی کتاب میں یہ حکم موجود ہو تو ضرُور ایسا کرنا چاہیے۔ مگر مجتہد بننے کی کوشش کرنا جُرات رندانہ کے سوا کچھ نہیں۔

زمانہ حال کے ایک مشہور صُوفی اور جید عالم حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی

نے اِس معمّے کا حل فرمایا ہے :

"ایک شخص نے عرض کیا جہاں درُود شریف پڑھا جاتا ہے۔ کیا وہاں رُوح محمدی تشریف فرما ہوتی ہے۔ حضور قدس سرہ نے فرمایا کہ رُوح مبارک کا تشریف لانا اِس طرح سمجھنا چاہیے کہ جیسے سُورج اپنی جگہ پر قائم ہے لیکن اس کی روشنی ہر جگہ موجود ہے رُوحانی سفر میں قرب و بعد عنصری نہیں ہوتا۔"

ملفوظات مہریہ ملفوظ ۱۶۷)

اس جواب میں علم ظاہری کے ساتھ نُورِ باطن کا امتزاج پایا جاتا ہے جس کی تفصیل یہ ہے

(۱) آپ نے حضورؐ کی موجُودگی کے لیے سُورج کی تشبیہ استعمال کی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ سُورج نہ کسی کے گھر آتا ہے نہ کسی محفل میں اس کی آمد ہوتی ہے بلکہ اپنی جگہ پر موجود ہے اور ہر طرف ضیا پاشی کر رہا ہے۔ اسی طرح حضورؐ اکرم اپنے مرکز پر قیام فرما ہوتے ہیں اور آپ کے انوار چار دانگِ عالم میں پھیل جاتے ہیں، محاورہ میں کہا جاتا ہے "کہ قطب از جانجنبد" اگر یہ بات تصوف کی زبان میں کی جائے تو ظاہر ہے کہ حضورؐ کے سامنے قطب کی کیا حیثیت ہے جب قطب اپنی جگہ نہیں چھوڑتا تو حضورؐ اپنا مرکز کب چھوڑتے ہیں۔

(۲) جہاں درُود شریف پڑھا جائے وہاں حضورؐ کے انوار و برکات نہایت تیزی اور شدّت کے ساتھ پہنچتے ہیں جن کا مشاہدہ اہل کشف اولیائے کرام کو واضح طور پر ہو جاتا ہے۔

(۳) سُورج کی تشبیہ میں ایک اور نکتہ بھی پایا جاتا ہے۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ کرۂ ارض کے ایک حصّہ میں دن ہوتا ہے سُورج کی روشنی پہنچ رہی ہوتی ہے مگر دوسرے حصّے میں رات ہوتی ہے اور وہاں اندھیرا چھایا رہتا ہے۔ جس سے ظاہر ہے

کہ زمین کے جس حصے کا رُخ سُورج کی طرف ہو وہاں نظر بھی آتا ہے اور روشنی بھی ہوتی ہے اور جس کا رُخ سُورج سے پھرا ہُوا یا یوں کہیئے کہ جس حصے کی پیٹھ سُورج کی طرف ہو وہاں اندھیرا ہوتا ہے سُورج کی موجُودگی کے باوجود وُہ سُورج کے نظارے اور اُس کی روشنی سے محروم رہتا ہے۔

(۴) جن محفلوں کے متعلق سوال پُوچھا گیا ہے وہاں درُود و سلام پڑھا نہیں جاتا بلکہ گایا جاتا ہے۔ موسیقی یا راگ سے حضورؐ کی دِلچسپی یا اسے پسندیدہ سمجھنے کا کہیں ثبوت نہیں ملتا بلکہ اس کی مذمت ثابت ہوتی ہے۔ اس لیئے درُود و سلام کو بھیرویں یا مال کونس کی طرز پر پڑھنے سے اندیشہ ہے کہ کہیں حضورؐ کی اس وعید کا نشانہ بن جائے کہ من احدث فی امرنا ھذا مالیس منہ فھو رد

لفظ رد کے معنی پھرنا ہوتا ہے، جس کا مطلب یہ ہُوا کہ جہاں راگ شروُع ہوا حضور اکرمؐ سے رُخ پھر گیا۔ جب سُورج کی طرف پیٹھ ہو گئی تو اس کی روشنی وہاں کیسے پہنچے۔

اِس ساری تفصیل کا ماحصل یہ ہے کہ جو کام خواہ عبادت مروجہ ہو یا غیر عبادت حضور اکرمؐ کی سُنّت کے مطابق کیا جائے۔ تو وہاں حضورؐ کے انوار پہنچتے ہیں اور جو کام سُنّت کو بالائے طاق رکھ کر محض اپنی خواہش کے مطابق کیا جائے وہاں ظلمت ہی ظلمت ہوتی ہے۔ خواہ وُہ کام بظاہر عبادت کا کام ہو ۔ ع

بحق دِل بند و راہ مُصطفےؐ گیر

سوال ۱۵ (۱) سخت پریشان ہوں نیند بالکل نہیں آتی۔
(۲) میں نے کسی کے ساتھ کبھی کوئی زیادتی نہیں کی مگر ......
مجھے ہر نقصان پہنچانے پر ہر وقت کمربستہ ہے۔
(۳) آپ جانتے ہیں کہ ... میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ اس کا میرے ساتھ جو رویہ ہے اس میں اپنائیت کا شائبہ کم ہی رہ گیا ہے۔
مرنے کی آرزو میں جئے جا رہا ہوں میں

الجواب: (۱) نیند نہ آنے کی وجہ تو پریشانی ہے۔ مگر پریشانی کی وجہ کیا ہے؟ نیند کا تعلق دماغ سے ہے۔ دماغ فارغ ہو تو نیند آئے آدمی مسلسل سوچ میں محو رہے دماغ کو چھٹی ہی نہ دے تو نیند کیونکر آئے مگر آپ سوچتے کیا ہوں گے؟ پریشانی کی شکایت کرنے والوں کے متعلق دیکھا گیا ہے کہ عموماً ایک ہی بات سوچتے رہتے ہیں اور وہ یہ کہ یوں کیوں ہوگیا؟ ایسے کیوں نہ ہوا؟ انہوں نے یہ کیوں کہا؟۔ اگر انہوں میرے خلاف یہ قدم اٹھائے تو میں اس کا توڑ کیسے کروں؟ بس اسی قسم کی سوچ میں پھنسے رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی زندگی کا بھی ایک اصول ہوتا ہے اسے اصول تجویز کہتے ہیں۔ اس اصول کی صورت یوں سمجھئے کہ آدمی اپنے ہر فعل کا ایک نتیجہ فرض کر لیتا ہے اور ہر واقعہ کی ایک فرضی صورت پہلے متعین کر لیتا ہے کہ یوں ہوگا۔ مگر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ نتیجہ اس کی توقعات کے خلاف ظاہر ہوتا ہے۔ انسان اسے اپنی شکست سمجھتا ہے۔ اس حادثہ کو برداشت نہیں کرسکتا۔ حالانکہ انسان تو اس کائنات کی مشینری کا ایک پرزہ ہے۔ نہ یہ پوری مشین ہے نہ اس مشین کو چلانے والا میکینک ہے۔ مگر لطف

یہ کہ اپنی اس بے بضاعتی کے باوجود چاہتا ہے کہ ساری کائنات کی مشین میری خواہش کے مطابق حرکت کرے۔ یوں انسان اپنے آپ کو مدبر کائنات کے منصب پر فرض کر لیتا ہے مگر نرے مفروضوں سے حقائق نہیں بدلا کرتے۔ چنانچہ جو اصل مدبر کائنات ہے وہ اپنے پروگرام اور اپنی پالیسی کے مطابق نظام چلاتا ہے۔ انسان اسے اپنی شکست سمجھتا ہے اس لئے سخت پریشان ہوتا ہے۔ گویا انسان کی پریشانی کی وجہ ہے کہ اس نے پہلی غلطی یہ کی کہ کائنات میں اپنا مقام نہیں پہچانا۔ دوسری اس سے بھی بڑی غلطی یہ کی کہ اپنے لئے وہ مقام تجویز کیا جو کسی طرح اس کے حسب حال نہیں۔ گویا ایک قدم پر دو ٹھوکریں کھا گیا۔ اب وہ سنبھلے تو کیسے؟

اس بیماری کا علاج یہ ہے کہ زندگی کا اصول بدلا جائے۔ اصول تجویز کی جگہ اصول تفویض اپنا لیا جائے۔ یہ اصول ایک جملے میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ اپنی ڈیوٹی دیانتداری سے پوری کرو اور نتیجہ اس پر چھوڑ دو جو کائنات کا نظام چلا رہا ہے۔ اور پھر جو نتیجہ نکلے اس پر اس انداز سے غور کرو کہ جب اس نے اعلان کر رکھا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْم یعنی یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ بڑی رافت و رحمت کا سلوک کرتا ہے تو جو نتیجہ سامنے آیا ہے اسی میں بہتری ہے۔ اسی رویہ کا نام صبر ہے۔ اور یہی وہ وصف ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے صابرین کو بڑے مژدے سنائے ہیں ؛

کو بڑے مژدے سنائے ہیں، ایسے لوگوں کا رویہ کیا ہوتا ہے اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ جن لوگوں کو مخاطب کرکے یہ کہا گیا تھا وہ تو صبر کے پہاڑ تھے، اس گئے گذرے زمانے میں بھی ایسے لوگ ملتے ہیں جو اصول تفویض کے تحت زندگی بسر کرکے پریشانیوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ آپ نے سنا ہوگا کہ مولانا محمد علی جوہر قید فرنگ میں تھے کہ انھیں اطلاع ملی ان کی اکلوتی بیٹی بستر مرگ پہ ہے آپ نے سن کر یہ قطعہ لکھ بھیجا ــــــــــ

میں ہوں مجبور پہ اللہ تو مجبور نہیں
تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں
تیری صحت ہمیں منظور تھی لیکن اس کو
نہیں منظور تو پھر ہم کو منظور نہیں

لیجئے بات ختم ہوئی ورنہ قید فرنگ کے ساتھ بند غم میں ہی گھل گھل کر مرجاتے

(۲) ہر کام کا ایک محرک ضرور ہوتا ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ میں نے کسی کے ساتھ برائی کرنے کی ہمت ہی نہیں کی، یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا محرک کونسا جذبہ یا خیال ہے۔ اگر آپ اپنے اندر کسی کے ساتھ برائی کرنے کی ہمت ہی نہیں پاتے تو اس میں آپ کا کونسا کمال ہوا، مگر اس کا وجود دنیا میں مشکل ہی سے ملے گا کیونکہ ہر شخص میں کسی نہ کسی کے ساتھ کسی درجے کی برائی کرنے کی ہمت یقیناً پائی جاتی ہے اگر اس کا محرک یہ خیال تھا کہ میں کسی کے ساتھ برائی نہ کروں تاکہ کوئی میرے ساتھ برائی نہ کرے تو اسے خود غرضی کہا جائے گا اور یہ کوئی خوبی نہیں، اور اگر یہ نیت ہو کہ میں دوسروں کے ساتھ بھلائی کروں تاکہ لوگ اس کے بدلے میں اس سے بڑھ کر میرے ساتھ بھلائی کریں تو یہ کاروباری ذہنیت یا بنیاپن ہے۔ اس کی ممانعت بھی معلوم ہوتی ہے ولا تمنن تستکثر اور اگر اس کا محرک یہ جذبہ تھا کہ میرے

خالق نے مجھے حکم دیا ہے اور محبوب رب العالمین نے یہ تعلیم دی ہے کہ المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہٖ تو اس کے صلہ کی توقع خالق سے رکھنی چاہیئے۔ مخلوق سے توقع کیوں ہو۔ اور یہ یقین رکھنا چاہیئے کہ خالق صرف عادل ہی نہیں رحیم و کریم بھی ہے ضرور صلہ دے گا اور استحقاق سے بڑھ کے دے گا مگر یہ کرنسی دارالجزاء کے ملک کی ہے دارالعمل کی نہیں۔ لہٰذا مخلوق سے توقع رکھ کر میں اپنا زرِ مبادلہ کیوں ضائع کروں سوچ کا یہ انداز ایسی دولت ہے کہ اس کے نتیجے میں سکونُ اطمینان لازماً حاصل ہوتا ہے۔

ایک مثال عرض کرتا ہوں۔ آپ جا رہے ہیں راستے میں کوئی کُتّا آپ کو بھونکتا یا کاٹ لیتا ہے۔ یا کوئی سانپ بچھو آپ کو ڈس لیتا ہے کیا آپ اُس وقت یہ سوچنے بیٹھ جائیں گے کہ میں نے اس کے ساتھ کوئی بُرائی نہیں کی۔ اُس نے مجھے کیوں کاٹا یا یہ کہیں گے کہ کتے کا کام بھونکنا اور کاٹنا ہے اور سانپ یا بچھو کی سرشت ڈسنا ہے۔ اسی طرح بعض انسان نما حیوان سانپ اور بچھو کی سرشت رکھتے ہیں۔ پھر آپ کو ان سے یہ توقع کیوں ہو کہ اپنی عادت یا سرشت کے خلاف کیوں نہیں کرتے اس کی ایک وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے اس کے کرتوتوں کی وجہ سے سخت ناراض ہوتا ہے تو اسے ڈھیل دیتا ہے۔ جب وہ برائی میں انتہا کو پہنچ جائے تو گرفت کرتا ہے اور اس کی گرفت بڑی سخت ہے۔ یہ معاملہ افراد سے بھی ہوتا ہے اور قوموں سے بھی جیسا کہ ارشاد باری ہے۔

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتّٰى اِذَا فَرِحُوْا بِمَا اُوْتُوْا بِهٖ اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ۔

لہٰذا جسے برائی کی کھلی چھٹی مل گئی اس بدنصیب کی حالت تو قابلِ رحم ہے۔ اس کے

حق میں دعا کرنی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ اسے دیدہ بینا عطا فرمائے۔

(۳) آپ کو اپنے بیٹے کے متعلق جو شکایت ہے وہ ایک حد تک طبعی امر ہے مگر اس سوچ میں گھلتے رہنا بھی اسی اصول تجویز کے کرشمے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آپ نے اس کی پرورش، تعلیم اور تربیت میں کوئی کمی نہیں کی تو کیوں؟ اگر اس لئے کہ یہ بڑا ہوگا تو اس احسان کا بدلا چاہے گا تو لازماً آپ کو اس سے گلہ بھی ہوگا اور اپنی محرومی کا احساس بھی۔ اور اگر آپ نے یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ جس نے یہ بیٹا دیا تھا اس نے یہ فرض بھی مجھے سونپا تھا، لہٰذا اگر میں نے اپنا فرض ادا کیا تو اپنے خالق کے حکم کی تعمیل کی لہٰذا مجھے اس کا صلہ بھی خالق کے ہاں سے ملے گا۔ اگر آپ نے اپنی غرض بیٹے سے وابستہ کرلی تو اس نے کسی اور سے وابستہ کرلی ہوگی، اس میں شک نہیں کہ باپ کو بیٹے کے ساتھ محبت ہونا طبعی امر ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ سے انسان کی محبت عقلی کو محبت طبعی پر غالب کرنا ہی کمال ہے، شاید اسی لئے ارشاد ہے

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۔ ۔ ۔ ۔ محبت طبعی کا تقاضا تھا کہ باپ نے درخواست کی اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر جب ادھر سے اصول تفویض کی تعلیم دیتے ہوئے جواب ملا کہ :——

لَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ تو جھٹ عرض کیا رَبِّ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ وَاِلَّا تَغْفِرْ لِيْ وَتَرْحَمْنِيْٓ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ۔

یعنی محبت عقلی، محبت طبعی پر غالب آگئی یعنی اہل وعیال اولاد مال منال سے تعلق حفاظت کا ہو اور خالق سے تعلق محبت کا ہو۔ فانی کی محبت سے مایوسیاں ہی پلے پڑتی ہیں۔

پریشانی کبھی امتحان بنتی ہے کبھی محو سیئات کا سبب اور کبھی رفع درجات کا ذریعہ اور کبھی سزا بن جاتی ہے۔

جب مصیبت پر گلہ شکوہ، ہائے وائے، اور بے صبری کا اظہار ہو تو یہ سزا

کی صورت ہے اور اگر صبر اور راضی بہ رضا ہونا نصیب ہو جائے تو یہ محسوسیات بھی ہوتی ہے اور رفع درجات کا ذریعہ بھی بن سکتی ہے۔

اس لئے میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ ذکر الٰہی اور فکر آخرت کی طرف زیادہ توجہ دیں مومن کے یہ دو بڑے ہی کامیاب ہتھیار ہیں۔

غم چو آید زود استغفار کن
غم با مر خالق آید، کار کن

یہ دعا کیا کریں، بلکہ اکثر یہ ورد زبان رکھیں اور یقین قلب کے ساتھ کہا کریں: اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَاِلَیْکَ الْمُشْتَکٰی وَبِکَ الْمُسْتَغَاثُ وَاَنْتَ الْمُسْتَعَانُ وَلَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْہِ اُنِیْبُ

س ۱۶: دیکھا گیا ہے کہ بعض اوقات کوئی معروف اور فاضل آدمی ایک بات کہتا ہے اور بڑے سلیقے سے کہتا ہے مگر اس کا اثر سننے والے پر کچھ نہیں ہوتا، اس کے برعکس اُس فاضل سے کم تر درجے کا آدمی سادہ الفاظ میں ایک بات کہتا ہے وہ دل میں گھر کر جاتی ہے حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہونا چاہیئے۔ تو پھر اس کی وجہ کیا ہے۔

ج: اثر کے لئے کام کرنے والے تین عوامل ہیں۔ اوّل کہنے والا، دوسرا سننے والا، تیسرے وہ بات جو کہی گئی ہے۔ اِن تینوں کا اپنا اپنا کردار ہے اور یہ ان کے اوصاف میں اختلاف کی وجہ سے مختلف ہوتا ہے۔

(۱) کہنے والا:۔ ایک فاضل آدمی جب کوئی بات کہتا ہے تو اسکا اثر نہ ہونے

کی کئی وجوہات ہیں مثلاً :-

(ا) وہ اپنی علمیت کی سطح کے مطابق بات کہتا ہے سُننے والوں کی ذہنی سطح کا لحاظ نہیں رکھتا۔

(ب) وہ صرف اپنے آپ کو منوانے کے لئے بات کہتا ہے

(ج) اس کی بات حلق سے نکلتی ہے۔ اس میں صرف اتنی طاقت ہوتی ہے کہ کانوں تک پہنچ سکتی ہے۔ اور وہاں بھی صرف پہنچتی ہے مار نہیں کرتی۔ اس کے مقابلے میں کم تر درجے کے آدمی کی بات اثر کر جاتی ہے تو اس کی بھی کئی وجوہات ہوتی ہیں مثلاً :——

(ا) وہ سُننے والوں کی ذہنی سطح کے مطابق بات کرتا ہے

(ب) اس کی غرض اپنی ذات کو منوانا نہیں بلکہ بات پہنچانا مقصد ہوتا ہے۔

(ج) بات اس کے دِل کی گہرائیوں سے نکلتی ہے اس میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ کانوں کے راستے دِل میں اُتر جاتی ہے کیونکہ اس کا اصل نشانہ وہی ہوتا ہے۔

اس فرق کو یوں سمجھئے کہ تھری ناٹ تھری کی ایک گولی لے کر کوئی پہلوان قسم کا آدمی اپنے ہاتھ سے پُوری قوت سے پھینکے تو زیادہ سے زیادہ کسی کو چوٹ سی لگ سکتی ہے اور اگر اسی گولی کو رائفل کی نالی میں رکھ کر بڑے آرام سے ہاتھ کی ایک اُنگلی سے ایک بچہ بھی بلبلی دبا دے تو وہ گولی نہ جانے کتنے آدمیوں کو چیرتی پھاڑتی ہوئی پار نکل جاتی ہے اس لئے اصل قوت علم یا آواز یا لہجہ کی نہیں ہوتی بلکہ بات کے اثر کرنے کے لئے حقیقی قوت کہنے والے کی دِل سوزی اخلاص اور سادگی ہے۔ جس کہنے والے میں یہ تین اوصاف ہوں گے اس کی بات زیادہ اثر کرے گی خواہ وہ کم علم اور گمنام ہی کیوں نہ ہو۔

دُوسرا عامل سُننے والا ہے :-

سُننے والے کے اعتبار سے بھی اثر کی قوت بدل جاتی ہے۔ مثلاً :-

(ا) اگر وُہ سیکھنے کی غرض سے نہیں بلکہ تنقید کی غرض سے سننے آیا ہے تو بات اگر اس کے معیار مطلوبہ کے مطابق کی گئی ہے تو اس کا اثر تو ہوگا مگر صرف واہ واہ تک، اور اگر سیکھنے کی غرض سے سُنے گا تو اس کا اثر دِل و دماغ اور کردار تک جا سکتا ہے جبکہ بات اس کی ذہنی سطح کے مطابق کی گئی ہو۔

(ب) اگر سُننے والا تنقیص کی غرض سے سُنتا ہے۔ مخالفت کرنے کے بہانے تلاش کرنا چاہتا ہے تو کہنے والا خواہ فاضل ہو یا عامی کوئی فرق نہیں پڑتا،

(ج) سُننے والا اگر سیکھنے کی غرض سے سُن رہا ہے مگر پُوری طرح متوجہ نہ ہو تو بات اثر نہیں کر سکتی جیسے موسلا دھار بارش میں ایک پیالہ اُلٹا کر کے رکھ دیں تو اس کے اندر کی سطح بھی تر نہیں ہوگی اور اگر کسی جگہ سے قطرہ قطرہ پانی ٹپک رہا ہو اس کے نیچے ایک گھڑا رکھ دیں تو کچھ دیر بعد وُہ گھڑا بھی لبالب بھر جائے گا۔

(د) سُننے والے کے اندر قبولیت کا ارادہ اور کہنے والے سے عقیدت موجُود ہو تو بات کا اثر یقینی اور دیرپا ہوتا ہے۔ اور اگر سُننے والا نہ ماننے کی قسم کھا کے بیٹھا ہو یا اس کے ذہن کا رویہ مدافعانہ یا جارحانہ ہو تو بات کا اثر نہیں ہو سکتا۔

تیسرا عامل بات ہے جو کہی گئی : اثر پیدا کرنے میں اس کو بھی دخل ہے

(ا) بات ایسی ہو جو سُننے والے کے مزاج اور اس کی نفسیات کے خلاف ہو تو اثر نہیں ہوگا۔ مثلاً ایک چور کے سامنے جب چوری کے فن کی بات کی جائے گی تو شوق سے سُنے گا اور اپنے فن کو ترقی دینے کی تدبیریں سوچے گا۔

(ب) بات اگر سننے والے کے مزاج کے خلاف ہو مگر کہنے والا اس کے اندر تبدیلی لانا چاہتا ہو تو اس کی نفسیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے بات کرے تو اس کے اندر تبدیلی لا سکتا ہے جیسے کسی بچے سے اس کی مرضی کے خلاف اور اس کی پسند کے خلاف کوئی کام کرانا ہو۔ تو کھیل کھیل میں اسے بہلا کر اس کی روش کو بدلا جا سکتا ہے۔

(ج) اگر بات کا تعلق کسی عارضی مفاد سے ہو تو اس کی نسبت کم اثر کرے گی جس کا تعلق دیرپا اور مستقل مفاد سے بشرطیکہ سننے والے میں مفاد کی حقیقت اور عارضی اور مستقل مفاد میں تمیز کرنے کی اہلیت ہو۔

اس تفصیل سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ بات کے اثر کرنے کا زیادہ تر انحصار اس امر پر ہے کہ :۔

کہنے والا خلوص، دل سوزی اور خیر خواہی کے جذبے سے کہے۔ تصنع تکلف اور ریا سے پاک ہو اور سننے والا۔ شوقِ عقیدت اور خود سپردگی کے جذبے سے سنے تو بات ضرور اثر کرتی ہے۔ مگر یہ سب عادی امور ہیں اور اصولی باتیں ہیں جہاں خرقِ عادات کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ وہاں یہی کہنا پڑتا ہے کہ مقلب القلوب جب چاہے اور جس کے متعلق چاہے اور جس کے ذریعے چاہے آنِ واحد میں دل کی دنیا بدل دیتا ہے ؎

سوال:۔ آپ سے وہ طریقہ پوچھنا ہے جس سے ہم حج کے لیے زیادہ سے زیادہ اپنے قیام کو بامقصد گذار سکیں۔ اس دفعہ جانے میں اپنے ساتھ ذہن میں کچھ پرابلم بھی ساتھ لے جارہا ہوں۔ مثلاً کہ غارِ حرا میں جب حضرت جبرائیل علیہ السلام نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھنے کے لیے کہا اور حضورؐ نے جواباً نہ جاننے کا کہا۔ حضرت جبرائیلؑ نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھیج دیا۔ اس وقت انسانی جذبے کی ایک نئی جہت کا آغاز ہوا اور اس تجربے کی انتہا معراج میں ہوئی۔ قرآنی آیات کے پیچھے تاریخی واقعات کے علاوہ تجربے کی ایک جہت موجود ہے۔ وہ جہت جاننا چاہتا ہوں اسی طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ غارِ حرا، کعبتہ اللہ اور قرآن کریم کی معرفت جاننا چاہتا ہوں اور وہاں جاکر زیادہ سے زیادہ اس انداز میں دیکھنا چاہتا ہوں۔

جواب:۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض نبوت دو قسم پر مشتمل ہیں۔ اوّل اللہ کریم سے براہِ راست لینا، دوم انسانیت کو وہ دولت تقسیم کرنا۔

اللہ نور السمٰوٰت والارض اس سے خاک کا پتلا کیسے بالمشافہ براہِ راست مکالمہ کرے اور کچھ حاصل کرے۔ اگر فرشتہ کے ذریعے ہو تو وہ بھی نورانی مخلوق تو اللہ کریم نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجودِ اطہر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا اللہ کریم سے لینے کے لیے حضورِ اکرمؐ کے قلب اطہر کو مختص فرمایا۔

فانہٗ نزلہ علیٰ قلبک یعنی نزولِ کتاب حضور اکرمؐ کے قلب اطہر پر ہوا اور اس قلب کی خصوصیت کیا ہے ارشاد فرمایا تنام عینای ولا ینام قلبی یعنی میری آنکھیں سوتی ہیں دل نہیں سونا اور نہ ہی سونا نوری مخلوق کی خاصیت ہے اور سونا خاکی مخلوق کا خاصہ۔

دوسرا پہلو خاکی مخلوق کو بانٹنا ہے تو اس عمل کے لیے ہم جنس ہونا ضروری ہے۔ تو قلب کے علاوہ جسم کا باقی حصہ جس میں زبان سرِفہرست ہے یہ مخلوق میں تقسیم کرنے کے لیے ہے۔ یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کتاب کے حصول کے اعتبار سے نوری ہیں اور کتاب کی تعلیم و تفہیم کے لحاظ سے خاکی ہیں مگر یہ قلب اطہر بھی تو جسدِ اطہر ہی میں موجود ہے۔

نزولِ کتاب کے وقت جسد کا متاثر ہونا قدرتی امر ہے اس جسدِ اطہر کو قلبِ اطہر کے ساتھ مناسبت پیدا کرنے کے لیے دو تدابیر ہیں۔

۱۔ تبتل کے ساتھ ذکرِ الٰہی تو غارِ حرا اسی کا محل اور مقام ہے۔

۲۔ ایک نورانی مخلوق جبرئیل امینؑ انسان کی شکل میں متشکل ہو کر جسدِ اطہر کو تین مرتبہ بھینچنا دوسری تدبیر ہے۔ اسی بناء پر صوفیائے کرام ذکرِ قلبی سکھاتے وقت تین دفعہ توجہ دیتے ہیں۔

معلوم ہُوا کہ غارِ حرا تبتل کا سمبل ہے کعبۃ اللہ زندگی کا دوسرا پہلو ہے۔ یعنی اللہ کریم سے لینے کے بعد آدم خاکی کے اندر اور باہر، ذہن اور اعضاء و جوارح میں کیا تبدیلی آنی چاہیئے تو اس کے لیے کعبۃ اللہ کو مرکز قرار دے کر اس کے گرد جسمِ خاکی کا گھومنا اور طواف کرنا دراصل اس حقیقت کی مادی اور مرئی صورت ہے کہ جس طرح میرا قلب اور میرا ذہن اللہ کی رضا کے گرد گھومتا ہے اسی طرح میرا یہ مادی جسم اس مادی مرکز کے گرد گھومتا ہے۔

قرآن: سوچ ہو یا عمل ذہن ہو یا اعضاء و جوارح انسانی کے مرکز اور محورِ ذات الٰہی، محبتِ الٰہی اور رضائے الٰہی ہیں مگر اس اقدام کا سلیقہ اور طریقہ قرآن سے سیکھنا ہو گا۔ قرآن سے بے نیاز ہو کر جو عمل بھی کیا جائے اسے عملِ صالح نہیں کہا جا سکتا لہٰذا اس کا مرکز بھی محبتِ الٰہی نہیں ہو سکتا۔

قرآن ایک طرف تو رہنما ہے دوسری طرف ذاتِ باری سے ہمکلام ہونے کا ذریعہ ہے۔

حرمین شریفین چونکہ نزولِ قرآن کے محل اور مقامات ہیں اور غارِ حرا سے اس کا آغاز ہُوا لہٰذا ان تمام واقعات کو نزولِ قرآن کے حوالے سے دیکھنا اور اس پر سوچنا حقیقت کے قریب لے جانے کی تدبیر ہے۔

معراج: جسمِ خاکی کو جبرائیل امین کے تین دفعہ بھینچنے سے نہ صرف یہ کہ جسمِ خاکی میں صفاتِ ملکوتی در آئیں بلکہ اس کی لطافت کا مظاہرہ اس وقت ہُوا جب جسمِ خاکی ملاءِ اعلیٰ میں پہنچ گیا بلکہ وہاں پہنچ گیا جہاں پہنچنے والا ہی جانتا ہے یا وہ جس نے پہنچایا۔

معراج کی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ جسم خاکی کی سواری نوری مخلوق براق کو بنایا گیا جبرئیل امینؑ ساتھ ہوئے مگر ایک مقام پہ پہنچ کر رُک گئے کہ اس سے آگے میں نہیں جا سکتا یُوں لگتا ہے جیسے عالمِ ناسوت کی کشش ثقل کے دائرے سے پہنچا کر جبرائیل الگ ہو گئے کہ آگے عالمِ لاہوت کی کشش خود لے جائے گی۔ یعنی اب جسدِ اطہر میں وہ لطافت آ چکی تھی کہ آگے کسی دوسرے سہارے کی ضرورت نہ تھی۔

میری سمجھ میں تو یہی کچھ آتا ہے مگر میں نہیں جانتا کہ یہ جاننا حقیقت کے کتنا قریب ہے۔

سعودی عرب میں قیام کے دوران کرنے کا کام یہی ہے کہ آدمی سوچتا رہے کہ ان سنگلاخ چٹانوں سے جو ہدایت اور معرفت کا چشمہ پھوٹا ہے وہ پوری انسانیت کے لیے تھا میں نے اپنے دل و دماغ روح اور اعضاء و جوارح کو کس حد تک سیراب کیا اور کتنی کوتاہیاں ہوئیں۔ کوتاہیوں کے لیے زیادہ سے زیادہ استغفار اور آئندہ کے لیے زیادہ سے زیادہ توفیق کی دعا اور لیں۔ جانے سے پہلے حج کے مناسک خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔

سوال :- ابوان اتحاد سے ایک خط۔

جواب :- عام قاعدہ اور عوام و خواص کا اصولِ زندگی یہ ہے کہ فن کی بات ماہرِ فن سے پوچھی جائے اور اس کے قول کو AUTHORITY سمجھا جائے چنانچہ علاج کے سلسلے میں ڈاکٹر کی بات حرفِ آخر ہوتی ہے۔ تعمیر کے لیے کسی انجینئر سے مشورہ اور فیصلہ لیا جاتا ہے۔ موٹر میں نقص ہو تو کسی ماہر مکینک کا فیصلہ قبول کرنے میں عار نہیں سمجھا جاتا۔ البتہ ایک قومی المیہ یہ ہے کہ دین کی بات ہو تو ہر لال بجھکڑ مجتہد کی حیثیت سے بات کرتا ہے۔ صحت کی بات ہو تو کوئی نہیں کہتا کہ اس پہ ڈاکٹروں کی اجارہ داری ہے۔ تعمیر کا معاملہ ہو تو کوئی نہیں کہے گا کہ اس پہ انجینئروں کی اجارہ داری ہے۔ قانون کی بات ہو تو کوئی نہیں کہے گا کہ اس پہ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کی اجارہ داری ہے مگر دین کی بات کے متعلق بغیر جھجک کہا جاتا ہے۔ کہ اس پہ علمائے دین کی اجارہ داری ہے۔ مملکت کی قانون کی تعبیر کا حق تو سپریم کورٹ کے جج کو ہے مگر اللہ کے قانون کی تعبیر ہر ایرا غیرا نتھو خیرا کر سکتا ہے اور مطالبہ کر سکتا ہے کہ صحیح۔

مستند ہے میرا فرمایا ہوا

مگر زہے قسمت کہ آپ نے دین کے بارے میں کافی ریسرچ کی ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ آپ نے لکھا ہے۔

یہ طے شدہ بات ہے کہ اہلحدیث، بریلوی، دیوبند اور اہلِ تشیع کے بنیادی عقائد و نظریات میں کوئی فرق نہیں"

یہ آپ کی ریسرچ کا نتیجہ نظر آتا ہے۔ جب یہ طے شدہ ہے تو ظاہر ہے کہ کسی نے طے کیا ہوگا اور یقیناً وہ اس فن کے ماہر ہوں گے جنہوں نے یہ طے کیا اس لیے ان کا قول سند ہے اور وہ اس میں اتھارٹی ہیں۔

یہ آپ ہی جانتے ہوں گے کہ وہ طے کرنے والے کون ہیں؟ ہم کم علموں کو تو اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ البتہ جو اہلِ تشیع کی چمات کتب کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا اس کا ماحصل یہ ہے۔

توحید:۔ انوارِ نعمانیہ ۱: ۲۰۹ شیعہ محدث الجزائری

"شیعہ نے بدا کا عقیدہ خدا کے لیے جائز رکھا اور بدا کے معنی یہ ہیں کہ خدا کسی شے کا ارادہ کرے پھر خدا پہ وہ ظاہر ہو جو پہلے ظاہر نہ تھا اور اس سے لازم آئے گا کہ خدا تعالیٰ امور کے انجام سے جاہل ہے اور یہ بات نہایت صحیح ہے"

۲:۔ اصولِ کافی

"زرارہ سے روایت ہے امام موسیٰ رضا فرماتے ہیں کہ اللہ نے کوئی ایسا نبی نہیں بھیجا جس سے شراب کے حرام ہونے کا اور عقیدہ بدا کا اقرار نہ لیا ہو"

عقیدۂ رسالت:۔

مختصر بصائر الدرجات ص ۲۱۳

"جب امام مہدی ظاہر ہوں گے تو سب سے پہلے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ہاتھ پر بیعت کریں گے"

یعنی امام مہدی پیر ہوگا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مرید ہوں گے۔

شیعہ کا متفقہ عقیدہ :۔

"ائمہ کا درجہ تمام انبیاء سے بلند ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، کے برابر ہے۔"

ختم نبوت کا عقیدہ :۔

مرزائیوں نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایک نبی مانا وہ کافر قرار پائے۔

شیعہ کا عقیدہ : اصول کافی

"امام پر وحی آتی ہے۔ شب قدر میں عقائد میں ترمیم و تنسیخ ہیں ہے۔"

۲۔ شرح صافی کتاب التوحید صہ ۲۲۷

"ہر سال کے لیے علیحدہ کتاب ہے۔ کتاب سے مراد یہ ہے کہ ان میں ان احکام و واقعات کی تفسیر جن کی امام کو آئندہ سال تک حاجت ہو۔ ملائکہ اور روح القدس شب قدر میں یہ کتاب لے کر نازل ہوتے ہیں۔ اس کتاب کے ذریعے اللہ تعالیٰ جن عقائد کو چاہے باطل قرار دیتا ہے اور جنہیں چاہے قائم رکھتا ہے۔"

شیعہ کا بنیادی عقیدہ ہے کہ "امام مامور من اللہ ہوتا ہے مفترض الطاعت ہوتا ہے اور معصوم عن الخطا ہوتا ہے۔ امام پر وحی آتی ہے۔"

یہ چاروں نبوت کی خصوصیات ہیں۔ مرزائی ایک نبی کے ماننے سے کافر ہوا اور شیعہ بارہ نبی مان کر مسلمان کے مسلمان ہی رہے۔

قرآن :۔ فصل الخطاب ۳۳۵

"جو قرآن جبریل امین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے تھے وہ سترہ ہزار آیات کا تھا۔ اور سلیم کی روایت کے مطابق ۱۸ ہزار آیت کا تھا۔ موجودہ قرآن ۶۲۳۶ آیت کا ہے۔"

شیعہ کا اقرار :۔ (۱) تحریف قرآن کی روایات شیعہ کی معتبر کتابوں میں موجود ہیں جن پر شیعہ مذہب کا مدار ہے۔ (فصل الخطاب)

۲۔ تحریف قرآن کی روایات کثیر ہیں۔ بلکہ دو ہزار سے زائد ہیں (ایضاً)

۳۔ قرآن میں ہر قسم کی تحریف کی گئی ہے کلمات آیات، سورتیں، کمی بیشی۔

۴۔ تحریف قرآن کا عقیدہ رکھنا ضروریات دین شیعہ سے ہے۔ (تفسیر مراۃ الانوار) اور ضروریات دین کا انکار کفر ہے۔

۵۔ تحریف قرآن کی روایات کا انکار کریں تو امامت کے عقیدے کا انکار بھی کرنا پڑتا ہے۔ (فصل الخطاب)

۶۔ تحریف قرآن کا عقیدہ عادت اور عقل کے عین مطابق ہے۔ (ایضاً)

"اصل قرآن کسی کو دیکھنا نصیب ہی نہیں ہوا۔ وہ اماموں کے پاس دست بدست چلتا رہا اور بارہواں امام جو اس گیارہویں امام کا بیٹا ہے جو لاولد فوت ہوا اس قرآن کو لے کر غار میں چھپ گیا۔

عقیدہ آخرت ۔ مختصر بصائر الدرجات ص ۲۲۴

"قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سُنیوں کے ایمان کا حصہ ان سے چھین کر شیعوں کو دے دے گا۔ اور شیعہ کی تمام برائیاں ان سے چھین کر سنیوں کو دے دے گا۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے امام سے کہا قربان جاؤں کیا یہ مسئلہ کتاب اللہ میں ہے امام نے قسم کھا کر کہا ایسا ہوگا۔ اے ابو اسحاق کیا تم نے یہ آیت نہیں پڑھی۔ اولئک یبدل اللہ سیاتہم حسنات"

روضہ کافی ص ۱۶۴ امام باقر سے روایت ہے۔

"پھر ہمیں بلایا جائے گا تمام انسانوں سے حساب لینا ہمارے سپرد کیا جائے گا خدا کی قسم ہم جنتیوں کو جنت میں داخل کریں گے دوزخیوں کو دوزخ میں۔ پھر انبیاء کو بلایا جائے گا۔ وہ دو صفوں میں عرش کے پاس کھڑے ہو جائیں گے اور اس وقت کھڑے رہیں گے کہ ہم حساب لینے سے فارغ ہو جائیں"

کشف الغمہ ۲: ۷۴ امام نے فرمایا:

"اے زید پل صراط سے گذارنا ہمارے ذمہ ہے۔ وزن اعمال ہمارے ذمہ ہے شیعہ کا حساب لینا ہمارے ذمہ ہے"

عدل کا یہ نقشہ بھی سامنے رکھیں اور اللہ تعالیٰ کے عدل کا نمونہ بھی دیکھ لیں۔

عقیدہ امامت: محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین میں اس عقیدہ کا کوئی بیان نہیں۔ قرآن نے لفظ امام کافروں کے لیڈروں کے لیے بھی استعمال کیا ہے۔ فقاتلوا ائمۃ الکفر۔ مگر شیعہ کا عقیدہ یہ ہے۔

۱:۔ امامت اصولِ دین سے ہے جیسے توحید رسالت قیامت۔

۲:۔ امام اپنی موت کا وقت جانتے ہیں اور اپنے اختیار سے مرتے ہیں۔

۳:۔ امام ہر چیز کے متعلق جانتا ہے (یعنی خدا سے بھی سنیئر ہے کیونکہ خدا کو تو بدا ہوتا ہے)

۴:۔ ائمہ کی شان ملائکہ مقربین اور نبی مرسل سے بھی بلند ہے۔

۵:۔ امام غائب جب ظاہر ہوں گے تو تمام دنیا پر شیعوں کی حکومت ہوگی۔

۶:۔ مسئلہ رجعت ضروریاتِ دین سے ہے اس کا منکر مذہب شیعہ سے خارج ہے۔

۷:۔ بارہ امام۔ رسولِ خدا کی طرح معصوم اور مفترض الطاعت ہیں۔ ایک امر میں رسولِ خدا پر فضیلت رکھتے ہیں کہ انہیں حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دینے پر اختیار ہے۔

۸:۔ امام کے علام صرف قرآن وحدیث سے ماخوذ نہیں بلکہ ان کے علاوہ ان کے پاس یہ وسائل ہیں مصحف فاطمہ۔ کتاب علی چمڑے کا تھیلا جس میں اولین آخرین کے تمام علوم جمع ہیں ہر جمعہ امام کو معراج کرایا جاتا ہے۔ ہر سال شب قدر میں ان پر ایک کتاب نازل ہوتی ہے۔

۹:۔ جس طرح نبی کا تقرر من جانب اللہ ہوتا ہے اسی طرح امام کو بھی خدا ہی مقرر کرتا ہے۔

۱۰:۔ ہر امام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک رجسٹر ملتا ہے جس میں تمام شیعہ سُنی کے نام معہ ولدیت کے درج ہوتے ہیں۔ امام ہر آدمی کو دیکھتے ہی پہچان لیتا ہے۔"

اب آپ ذرا ریسرچ کریں اور دیکھیں کہ کیا یہ عقیدے اسلامی ہیں اور کیا مسلمانوں اور شیعوں کے عقائد میں بنیادی طور پہ کوئی فرق نہیں۔ پھر آپ لکھتے ہیں "ایک خدا" ایک رسولؐ۔ ایک قرآن، ایک کعبہ، ایک کلمہ رکھنے والے یقیناً ایک ہیں"

اس میں کوئی شک نہیں مگر یہ ایک ہے کہاں۔

۱:۔ شیعہ کا خدا جاہل ہے جب کوئی کام ہو چکتا ہے تو اسے خبر ہوتی ہے اور مسلمانوں کا خدا

ہر عیب سے پاک ہے۔

اور شیعوں کے تیرہویں امام خمینی نے کشف الاسرار صـ۔ ۱۰۷ پر فرمایا۔

"ہم خدا کی پرستش کرتے ہیں اور اس کو پہچانتے ہیں جس کے کام عقل کی بنیاد پر محکم ہوتے ہیں اور عقل کے خلاف کوئی کام نہیں کرتا۔ نہ اس خدا کو جو خدا پرستی، عدالت، دینداری کا ایک شاندار محل تعمیر کرے اور خود ہی اس کو ویرانی کے در پے ہو اور یزید معاویہ، اور عثمان اور ان جیسے دوسرے بدقماشوں کو انسانوں کی حکومت سپرد کر دے۔"

مسلمانوں کے خدا نے تو عثمان، معاویہ اور ایسے ہی خلفاء راشدین کو حکومت دی، مگر شیعوں کا اور خمینی کا بے بس خدا "ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم" کی تصویر بنا رہا۔

۲:۔ رسول :۔ مسلمانوں کا رسول افضل الانبیاء خاتم الانبیاء اور امام الانبیاء ہے۔

اور شیعوں کا رسول وہ ہے جو ان کے بارہویں امام کا مرید اور جو اماموں سے جو بیٹر کہ اسے حلال وحرام کے سلسلے میں کوئی اختیار نہیں۔ اور شیعوں کے ماڈرن امام کے نزدیک رسول کی شان یہ ہے :۔ کشف الاسرار صـ ۱۳۰

"مختصر یہ کہ اسی آیت اور ان قرآن کے ذریعے اور بہت سی احادیث سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ امامت کی تبلیغ کے سلسلے میں اللہ کا رسول لوگوں سے ڈرتا تھا! اگر کوئی شخص تاریخ و اخبار کی طرف رجوع کرے تو یہ حقیقت لوگوں کی سمجھ میں آجائے گی کہ پیغمبر کا لوگوں سے ڈرنا بجا تھا۔"

لیجئے شیعوں کا خدا جاہل، رسول ڈرپوک اور قرآن غائب۔

قرآن :۔ یہ گذشتہ صفحات میں آچکا ہے کہ شیعوں کے نزدیک اس موجودہ قرآن کو بدلا ہوا اور بگڑا ہوا نہ ماننا دینِ شیعہ سے خارج کر دیتا ہے۔

کلمہ :۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کلمہ سکھایا اور سب کو پڑھا کر مسلمان بنایا وہ ہے۔

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

اور شیعوں کا کلمہ اس کے ساتھ آگے بھی ہے کہ علی ولی اللہ وصی رسول اللہ وخلیفتہ بلا فصل۔

خدا جانے آپ کو یہ سب ایک کیسے نظر آنے لگا۔ غالباً کسی خورد بین سے آپ نے دیکھا ہوگا۔ اور نتیجہ یہ نکالا کہ، نور و ظلمت، رات اور دن کفر اور اسلام ایک ہی چیز ہے۔

آپ نے گروہ کو صحابہ کا متبع قرار دیا اور ایسا ہونا بھی چاہیئے۔ کیونکہ اللہ کریم نے قیام قیامت تک آنے والے ہر مسلمان پر اتباع صحابہ کو لازم قرار دیا ہے اور یہ اصولی بات ہے کیونکہ نبی اور امت کے درمیان صحابہ ہی واحد واسطہ ہیں، جن سے علوم نبوت امت تک پہنچے۔ صحابہ پر اعتماد نہ رہے تو دین اور نبوت کا کوئی عینی گواہ پایا ہی نہیں جاتا۔ تو اسی لیے اللہ کریم نے فرما دیا۔

وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ

اب رہی یہ بات کہ شیعہ نے اللہ، اس کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی مخالفت بلکہ دشمنی کا بیڑا اٹھا کر کیا گل کھلائے۔

۱:۔ رجال کشی صـ۴

"امام باقر سے روایت ہے کہ نبی کریمؐ کے بعد تمام صحابہؓ مرتد ہو گئے۔ صرف تین بچ گئے پوچھا وہ کون ہیں۔ وہ مقداد، سلمان اور ابوذر"

اب بتائے دین مرتدوں نے دنیا میں پھیلایا۔

۲:۔ تفسیر مرآۃ الانوار ۱: ۲۵۸

"امام باقر نے فرمایا ہمارے دشمنوں کا ذکر کتاب اللہ میں ان الفاظ میں ہوا ہے کسی کے لیے فحشا را، کسی کا منکر، کسی کا بغی، جوا، شراب، ازلام، طاغوت، مردار خون، خنزیر کا گوشت ان سب الفاظ سے مراد صحابہ رسول ہیں"

۳:۔ تفسیر الانوار ۱: ۲۵۸

آیت وینہی عن الفحشاء والمنکر والبغی۔

"امام باقر فرماتے ہیں فحشا سے مراد ابوبکر منکر سے مراد عمر، اور بغی سے مراد عثمان ہے"

۴:۔ احتجاج طبرسی طبع قدیم صـ۱۵۴

"خلفائے ثلاثہ کے عہد میں حق تو باطل ہو گیا اور باطل حق بن گیا۔ جھوٹ سچ

بن گیا اور سچ کا نام جھوٹ رکھ دیا گیا۔"

اتحاد کی دعوت تو مبارک کام ہے مگر مسلمانوں کو جن کے ساتھ اتحاد کی دعوت آپ دے رہے ہیں ان سے بھی پوچھئے وہ کیا کہتے ہیں۔ اگر وہ آپ کو نہیں بتاتے تو لیجئے ہم بتاتے ہیں:۔

۱:۔ روضہ کافی ص

"امام باقر نے فرمایا اے ابو حمزہ اللہ کی قسم ہمارے شیعوں کے بغیر دوسرے تمام انسان کنجریوں کی اولاد ہیں اور حرامی ہیں۔"

۲:۔ فروع کافی ۱: ۸

"امام جعفر نے فرمایا اللہ تعالےٰ نے کتے سے بڑھ کر پلید چیز کوئی پیدا نہیں کی اور سُنی تو کتے سے بھی زیادہ پلید ہے۔"

۳:۔ روضہ کافی ص ۱۱۲

"امام جعفر نے فرمایا سنی نماز پڑھے یا زنا کرے دونوں برابر ہیں یہ آیت ان کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ عاملۃٌ ناصبۃٌ تصلیٰ ناراً حامیۃً۔"

۴:۔ روضہ کافی ص ۱۸۱:۔ "سنیوں کے لیے دنیا اور آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔"

گذارش یہ ہے کہ ان حقائق پر آپ غور کریں اتحاد کی قسمیں بھی ہیں اور ہر قسم کی الگ حدود بھی ہیں۔ اتحاد بین المسلمین کا مفہوم اور تقاضے مختلف ہیں اور اتحاد بین الکافرین کے تقاضے اور حدود جدا ہیں۔

اگر آپ شیعہ مذہب کو جانتے نہیں تو جاننے کی کوشش کیجئے اور اگر جانتے ہیں تو بھولے بھالے مسلمانوں کو دھوکا دینے کی کوشش نہ کریں۔ اس کام کے لیے ایک خمینی ہی کافی ہے۔

سوال:۔ "اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں سورۃ لقمان کی آخری آیات میں صراحت کے ساتھ فرمایا ہے کہ ماں کے پیٹ میں "جو کچھ" ہے اس کا علم صرف اللہ کو ہے، لیکن میڈیکل سائنس آج یہ بتا دیتی ہے کہ ماں کے پیٹ میں لڑکا ہے یا لڑکی۔ یہ دعویٰ ارشادِ باری سے مطابقت

نہیں رکھتا۔

یہ سوال آج کل ہمارے "آفیسرز" کے حلقے میں ہر وقت زیرِ بحث ہے جس کا خاطر خواہ جواب یہاں پہ کوئی عالم دین نہیں دے سکا۔ اس وجہ سے آپ کو تکلیف دے رہا ہوں۔

جواب:۔ ذہنی مرعوبیت اور نظری غلامی اس سے بھی بڑے بڑے کرشمے دکھاتی ہے۔ دیکھئے آپ کا ارشاد ہے جو آپ کا نہیں بلکہ تمام آفیسرز کی ترجمانی ہے کہ "میڈیکل سائنس" آج یہ بتا دیتی ہے کہ ماں کے پیٹ میں لڑکا ہے یا لڑکی۔ آپ نے اس پہ بھی غور فرمایا کہ دعویٰ سچا بھی ہے یا نہیں؟ اگر غور نہیں فرمایا تو کیا اخبارات میں یہ بحث نہیں پڑھی کہ میڈیکل سائنس کے "امام" لیڈی ڈیانا کے پیٹ میں جھانکتے رہے اور ایک متفقہ فیصلہ دیا جو میڈیکل سائنس کی معراج اور سائنس دانوں یا میڈیکل سائنس کے ماہرین نے اپنی مہارت فن دکھاتے ہوئے دیا۔ لیکن بچے کی ولادت ہوئی تو نتیجہ بالکل اس کے برعکس نکلا جو میڈیکل سائنس نے دعویٰ کیا تھا۔ میں نے "بالکل" کا لفظ اس لیے لکھا ہے کہ اگر جیہ He اور شی She کے درمیان ہوتا تو بالکل لفظ درست نہیں ہو سکتا چونکہ ایسا نہیں ہوا اس لیے میں نے "بالکل" کا لفظ استعمال کیا ہے۔

یہ ہو سکتا ہے کہ میڈیکل سائنس کی بات کبھی درست بھی ثابت ہو جائے مگر اس کی حقیقت وہی ہے جو ایک منچلے نے کہا تھا کہ میں اور میرا بھائی دونوں اولیاء ہیں اور غیب کی خبریں بتا دیتے ہیں۔ پوچھا گیا وہ کیسے؟ کہنے لگا بادل جب نظر آتے ہیں تو میں کہتا ہوں بارش ہوگی اور میرا بھائی کہتا ہے نہیں ہوگی، تو کبھی میری بات درست ثابت ہوتی ہے، کبھی میرے بھائی کی بات درست ثابت ہوتی ہے لہٰذا ہم دونوں غیب کی خبریں جانتے ہیں۔

اب میں آپ سے عرض کروں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سنیئے۔ یہ اختلاف دلائل اور بے دلیل ہونے کا نہیں بلکہ اعتماد اور بے اعتمادی کا ہے۔ سائنس دانوں پہ چونکہ پورا اعتماد ہے اس لیے ان کی باتیں بے دلیل مان لینا "روشن خیالی" ہے۔ نبیؐ پہ چونکہ اعتماد نہیں اس لیے ان کی بات بے دلیل مان لینا "اندھی تقلید" ہے۔ یہ ہے "روشن خیالی"

اور" اندھی تقلید" کی حقیقت۔

اب آیئے اصل مسئلہ کی طرف۔ بات تو آپ کے سوال کے الفاظ میں ہی واضح ہو جاتی ہے مگر ادھر توجہ نہیں کی گئی۔ آپ کے سوال کے الفاظ میں:

ا:۔ ماں کے پیٹ میں "جو کچھ" ہے اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔

ب:۔ میڈیکل سائنس آج بتا دیتی ہے کہ ماں کے پیٹ میں لڑکا ہے یا لڑکی۔

ان دونوں statements کا فرق نوٹ فرمائیں۔ اللہ کو علم ہے "جو کچھ" ہے اور سائنس بتاتی ہے لڑکا یا لڑکی۔ جو کچھ کا مطلب یہ ہے کہ وہ گورا ہے یا کالا ہے۔ لانبا ہے یا ٹھگنا ہے، ذہین ہے یا کودن ہے، اندھا ہے یا سوانکھا ہے، فاسق فاجر ہے یا زاہد و عابد ہے، مومن ہے یا کافر ہے، امیر ہے یا مفلس ہے۔ بیمار ہے یا صحت مند ہے، گویا ہے یا گونگا ہے، بہرا ہے یا سنتا ہے، خوش قسمت ہے یا بدبخت ہے، امن پسند شہری ہے یا جرائم پیشہ....

یہ ہے "جو کچھ" کا اجمالی مفہوم تو سائنس نے اگر اس "جو کچھ" میں سے اتنا بتا دیا جو یقینی نہیں کہ لڑکی ہے یا لڑکا تو اللہ تعالیٰ سے برابری کا تصور کیسے پیدا ہو گیا۔

اب اس حقیقت کو ایک اور پہلو سے سمجھئے۔ یہ مسئلہ علم غیب سے تعلق رکھتا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر فن کی اصلاح کا خاص مفہوم ہوا کرتا ہے تو علم غیب کی تعریف یہ ہے کہ۔ جو کسی واسطہ، ذریعہ یا آلہ کے بغیر حاصل ہو اور وہ حضوری یا حصولی نہ ہو، علم غیب کہلاتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہے، کیونکہ مخلوق کو غیب کا جو علم ہوتا ہے وہ کسی واسطہ سے ہوتا ہے۔ اور حصولی ہوتا ہے مثلاً انبیاء کرام بعض غیب کی خبریں بتاتے ہیں ان کو یہ علم وحی و الہام کے واسطے سے حاصل ہوتا ہے۔ اولیاء کرام اگر ایسی کوئی بات بتاتے ہیں تو انہیں یہ علم کشف کے ذریعے اور واسطے سے حاصل ہوتا ہے اور وہ حصولی ہوتا ہے، سائنس دان اور موسمیات والے جو بتاتے ہیں وہ علم آلات کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اور وہ بھی ظنی ہوتا ہے یقینی نہیں ہوتا اس کی حیثیت صرف اتنی ہے کہ استاد نے بچے کو سکھا دیا کہ یہ الف

ہے یہ بے ہے یہ جیم ہے اب بچہ ڈنگیں مارنے لگے کہ میں اور استاد برابر کیونکہ میں نے بھی بتادیا کہ یہ الف ہے یہ بے ہے یہ جیم ہے اور استاد نے بھی یہی بتایا لہٰذا ہم دونوں برابر۔ بس یہاں بھی بات وہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پڑھا دیا یا بتا دیا انسان ڈنگیں مارنے لگے کہ میں اور اللہ برابر۔ اور اللہ کے بتانے کا ڈھنگ یہ ہوا کہ انسان کو عقل دی۔ اُس نے آلات ایجاد کئے اور ان آلات کی مدد سے اس نے وہ بات بتادی جسے وہ غیب سمجھتا ہے تو اس میں اللہ سے برابری کا سوال کہاں پیدا ہوا۔

اُمید ہے کہ یہ سوال اور اسی قسم کے اور سوال جو دراصل نادانی اور جہالت کے کرشمے ہوتے ہیں یا ضد و عناد کی کارستانیاں، آپ آسانی سے حل کر سکیں گے۔

مولانا تھانویؒ سے کسی نے پوچھا تھا کہ آجکل اعتراض زیادہ پیدا ہو رہے ہیں اور جوابات کم ملتے ہیں اس کی وجہ کیا ہے؟

آپ نے فرمایا اعتراض جہالت کی دلیل ہے اور جواب، علم کی، چونکہ جہالت بڑھتی جارہی ہے اس سے اعتراضات زیادہ جنم لے رہے ہیں اور علم گھٹتا جارہا ہے اس لیے جواب کم ملتے ہیں اور یہ سمجھ لیجئے کہ کثرت معلومات کا نام علم نہیں بلکہ علم تو ہے کہ ادراک سلیم اور قوی ہو جس سے ذہن صحیح نتائج پر پہنچ جاتا ہو۔ ان میں سے پہلی چیز "صورتِ علم" ہے، دوسری چیز "حقیقتِ علم" ہے۔

سوال نمبر ۱:۔

رسالت مآبؐ کے بعد ان کے علوم کا حقیقی وارث کون ہوا ہے؟ اگر آپ صحابہ کرامؓ کا نام لیں گے۔ تو اُس وقت ان میں بھی اختلاف رہا۔ اگر آپ علماء کرام کا نام لیں ان میں آج بھی اختلاف ہے۔ اگر آپ اولیاء کرام کا نام لیں تو ہر ولی کی طریقت جدا نظر آتی ہے۔ اگر آپ یہ کہیں کہ ان سب کی منزل ایک ہے۔ صرف راستے جدا جدا ہیں۔ تو میری نظر میں قابلِ قبول نہیں کیونکہ صراط مستقیم صرف ایک ہوتا ہے۔

سوال نمبر ۲:۔

کیا صحابہ کرامؓ پر ایمان لانا فرض ہے؟ اگر جواب ہاں ہو تو ایمان مجمل میں اس کا ذکر نہیں۔

اگر نہیں ہوتو ان کے نقش قدم پر نہیں چلنے والا دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ امر قطعی مسلمہ ہے کہ ہر شخص کا معیار فہم و ادراک یکساں نہیں ہوتا اور ہر شخص صادق اور امین بھی نہیں ہوتا۔ اگرچہ کہ وہ مخلص ہی کیوں نہ ہو۔ اب ایک استاد کی بات دوسرے شخص تک پہنچانے کے لیے انسان اپنی عقل کو بروئے کار لاتا ہے۔ مخلص ہونے کی بنا پر وہ یہ کوشش کرتا ہے کہ بعینہ وہ مدعا بیان کرے اور وہی الفاظ استعمال کرے۔ مگر پھر بھی غلطی ہو جاتی ہے۔ لہذا کیا عجب کہ وہ کلام کو پوری طرح سمجھ بھی سکا ہو یا نہیں۔ اور اس کے اپنے جذبات درمیان میں شامل ہو جائیں۔ ہاں اس کی صرف ایک ہی صورت ممکن ہے۔ اور وہ یہ کہ استاد خود کہے کہ میرے فلاں شاگرد نے میری بات کو سمجھا ہے۔ صحیح طور پر اور اس پر عمل پیرا بھی ہے۔ اگر یہ بات صحابہ کرامؓ پر منطبق آتی ہے تو کیوں کر تمام صحابہ لائق تقلید ہوئے؟ اور اگر نہیں آتی تو اس کی دلیل کیا ہے؟

سوال نمبر ۳:۔

اگر امام معصوم نہیں تھے تو ان کے غیر معصوم ہونے کی دلیل؟ آیت تطہیر کن اصحاب پر نازل ہوئی۔

سوال نمبر ۴:۔

تصوف کی جامع تعریف کیا ہے؟ اس ضمن میں حضور اکرمؐ کی کوئی حدیث مبارکہ ہو تو بتائیں۔

سوال نمبر ۵:۔

کیا اشرف الانبیاءؐ نے اپنے کسی صحابی کو ولی قطب، ابدال یا غوث کہہ کر مخاطب کیا؟ کیا آپ نے کسی علاقے کی ولایت تفویض فرمائی؟ کیا ان کے زمانے میں کوئی مجذوب یا سالک گذرا ہے۔ یا کسی صحابی پر حال وغیرہ چڑھتا؟

سوال نمبر ۶:۔

مرشد حقیقی کی چند صفات جن میں سے مجھے اس کا دامن پکڑنے میں جلد آسانی ہو۔

سوال نمبر ۷:۔

تمام نیک اعمال پر حتی الوسع عمل ہے۔ مگر نماز میں نہایت سستی بنیادی وجہ اور تدارک

بتائیں۔ عین نوازش ہوگی۔

جواب نمبر ۱:۔

علمی وراثت کے بارے میں ایک اصولی بات سمجھ لیں۔ نبی کریمؐ اور امت کے درمیان صحابہ کرام ایک واسطہ ہیں۔ نبی کریمؐ نے جو دولت بانٹی یا لٹائی وہ امت کو صحابہ کرامؓ کے ذریعے ہی پہنچی اگر یہ درمیانی واسطہ قابلِ اعتبار نہ ہو تو سارا دین ہی قابلِ اعتبار نہیں رہتا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس درمیانی واسطہ کو کیا اللہ کریم نے اور رسول کریمؐ نے قابلِ اعتبار قرار دیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس میں شک کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔ قرآن کریم کی ۔۔ اسے زیادہ آیات اس امر پہ شاہد ہیں کہ صحابہؓ قابلِ اعتبار ہی نہیں بلکہ نبی کریمؐ کی عطا کردہ دولت کے امین ہیں۔ اور مخلوق تک پہنچانا ان کے فرائض میں داخل ہے اور نبی کریمؐ کا ارشاد ہے جو اپنے حجۃ الوداع کے خطبے کے دوران سارے صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ جو موجود ہیں وہ ان تک پہنچائیں جو موجود نہیں"۔ یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سارے صحابہ کو دینی علوم کا وارث قرار دیا۔ اور امت کو اس کی ضمانت دی کہ اصحابی کا لنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم کہ میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں۔ جس کا دامن تھام لو گے تمہیں منزل مقصود تک پہنچا دے گا۔ اب یہ فیصلہ امت کو خود کرنا ہے۔ کہ وہ اللہ و رسولؐ کی بات پر اعتماد کرے یا انسانوں کی رائے کو پلے باندھے۔

جواب نمبر ۲:۔

صحابہ پر ایمان لانا فرض نہیں۔ البتہ قرآن کریم پہ ایمان لانا فرض ہے اور قرآن کریم میں چونکہ صحابہ کی عظمت، تقویٰ، صداقت بڑے اہتمام سے بیان ہوئی۔ اس لیے صحابہ کی عظمت کا انکار دراصل قرآن کا انکار ہے۔ اور یہ بات انسان کو دائرہ اسلام سے خارج کر دیتی ہے۔ اور حدیث نبوی ہے ان اللہ اختارنی و اختار لی اصحابی یعنی اللہ نے جس طرح میرا انتخاب کیا اسی طرح میرے لیے میرے صحابہ کا انتخاب فرمایا رب جسے انتخاب کرے بندہ کو اس میں عیب نظر آئے تو حیف ہے اس بندے پہ۔

جواب نمبر ۳:۔ اصول یہ ہے کہ کسی چیز کے وجود کی دلیل نہ ہونا خود اس کے عدم وجود

کی دلیل ہوتی ہے امام کے معصوم ہونے کی کوئی دلیل نہ ہو تا خود اس کے غیر معصوم ہونے کی دلیل ہے۔ اس اصولی بات کے علاوہ معصوم ہونے کی حقیقت اور ضرورت سمجھ لینا ضروری ہے۔ معصوم ہونا نبی کا خاصہ ہے اور اس کی ضرورت اس لیے ہے کہ نبیؑ نے اللہ کریم سے ہدایت لینی ہوتی ہے۔ اور ان تعلیمات کا مخلوق تک پہنچانا ہوتا ہے۔ اگر نبی معصوم نہ ہو تو سارا دین ہی قابلِ اعتبار ہو جائے گا۔ مگر امام کا منصب نبی کی طرح کوئی اسلامی منصب نہیں ہے بلکہ لیڈر یا پیشوا کو امام کہا گیا ہے۔ انبیاء کا لیڈر نبیوں کا امام ہوگا علماء کا پیشوا علماء کا امام ہوگا۔ کافروں کا لیڈر کافروں کا امام ہوگا۔

قرآن مجید میں امام کا لفظ استعمال ہوتا ہے اولیاء اور صلحاء کے امام۔ امام معصوم نہیں ہوتے۔ کیونکہ ان کا منصب براہِ راست اللہ تعالیٰ سے ہدایت حاصل کرنا نہیں ہوتا۔ البتہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی حفاظت کی جاتی ہے۔ اس لیے انہیں محفوظ کہتے ہیں۔ آیت تطہیر نبی کریمؐ کے گھر والوں یعنی ازواج مطہرات، امہات المومنین کو خطاب کرتے ہوئے ان کے حق میں نازل ہوئی اور یہ عصمت کی دلیل بھی نہیں۔ ازواج مطہرات کی ترکیب ہی ظاہر کرتی ہے۔ کہ انہیں یہ لقب آیت تطہیر کی وجہ سے ملا۔

جواب نمبر ۴:۔

تصوف کی جامع تعریف یہ ہے کہ یہ دین کا پریکٹیکل پہلو ہے۔ اس کے لیے قرآن کریم میں تزکیہ کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے اور حدیث پاک میں احسان کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کی حقیقت نبی کریمؐ نے یہ فرمایا ہے کہ احسان یہ ہے کہ تُو اللہ تعالیٰ کی عبادت یوں کر جیسے تو اُسے دیکھ رہا ہے۔ یہ وصف پیدا کرنا تصوف کا مقصود ہے۔

جواب نمبر ۵:۔

صحابی کا منصب اتنا بلند ہے کہ ولی، قطب، غوث اس کی جوتی کی خاک کے برابر بھی نہیں ہوتے لہٰذا صحابی کو غوث کہہ کر پکارنا ایسا ہے جیسا کسی صدر مملکت کو پٹواری کہہ کر پکارا جائے۔

حال پڑھنا ناقص ہونے کی دلیل ہے۔ کامل کو حال نہیں پڑھتا لہٰذا صحابی کو حال پڑھنا

ممکن ہی نہیں۔

جواب نمبر ۶:۔

مرشد حقیقی کی صفات دو قسم کی ہیں۔ ایک لازم دوسرا متعدی لازم یہ ہے کہ دین کا ضروری علم رکھتا ہو۔ دین کے احکام پر عمل کرتا ہو۔ سنت کا پابند ہو۔

متعدی:۔ یہ کہ دوسروں کو دین سکھانے اور ان کا عملی اصلاح کرنے کا سلیقہ اسے آتا ہو۔ اور یہ دونوں امور ایسے ہیں کہ عام آدمی اس پیمانے سے کسی کو ماپ نہیں سکتا۔ اس لیے اس کا دعوامی پیمانہ یہ ہے۔ کہ اس سے ملنے والوں کی سوچ اور عملی زندگی میں ایسی تبدیلی آجائے کہ دیکھنے والوں کو محسوس ہو کہ اس کی عملی زندگی پر محمد رسول اللہ کا ٹھپہ لگا ہوا ہے۔

جواب نمبر ۷:۔

آپ کے لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ ذکر الٰہی پابندی سے شروع کر دیں اور پورے خلوص سے کریں۔ اللہ کا نام خود راہ پیدا کر دے گا۔

سوال:۔ اتحاد بین المسلمین کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ مختلف حلقوں سے اس کی کوشش کا دعوی کیا جا رہا ہے۔

جواب:۔ کسی معاشرہ میں مختلف افراد کے درمیان اختلاف رائے ہونا ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کسی ایک ہی چیز کی دو مختلف راہیں ہو سکتی ہیں لیکن جس چیز کے اچھا یا برا ہونے کا فیصلہ خود خالق کائنات دے دے اس سے اختلاف کی صورت صرف ایک ہی ہو سکتی ہے کہ انسان کا اپنے خالق سے تعلق کٹ چکا ہو تو یہ جرکت کر سکتا ہے۔

اتحاد بین المسلمین صرف غیر متنازعہ فیہ ہی نہیں بلکہ اسے تو اللہ کریم نے اپنی نعمت قرار دیا ہے اور ایسی نعمت کہ اسے یاد رکھنے کی تاکید کی ہے۔ ارشاد باری ہے۔

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا یعنی "اے اہل ایمان ذرا وہ

وقت تو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کی جان کے درپے تھے ۔ پھر اللہ نے تمہارے دلوں کی دنیا میں وہ انقلاب پیدا کیا کہ باہمی نفرت کی جگہ تمہارے دلوں میں محبت بھر دی جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ تم مختلف قبائل سے تعلق رکھنے کے باوجود آپس میں بھائی بھائی بن گئے۔"

سوال یہ ہے کہ اتحاد کی یہ نعمت کیا پہلی دفعہ عرب میں تقسیم ہوئی؟ نہیں بلکہ انسان نے جب اس کرۂ ارض پہ بسنا شروع کیا تو یہ نعمت اسے اسی وقت عطا ہوئی۔ چنانچہ ارشاد باری ہے۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً۔

یعنی ابتدا میں لوگ ایک ہی امت تھے اور اُمت اسے کہتے ہیں جس کے افراد کے نظریات ایک ہوں، مقصدِ حیات ایک ہو، طریق کار ایک ہو۔

جب بنیادی طور پہ سب انسان ایک امت تھے تو پھر ان میں اختلاف اور باہمی مخالفت کب اور کیوں پیدا ہوگئی ۔ اسی کتاب سے جواب ملتا ہے کہ جب بعض لوگوں نے خالق کی طرف سے آئی ہوئی ہدایات سے اختلاف کرنا شروع کر دیا تو ان کے دل کی دنیا بھی بدل گئی ۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اتحاد کی بنیاد ایمان ہے ۔ اور اس حقیقت کو اللہ کریم نے واشگاف الفاظ میں بطور ایک اصول کے بیان فرمایا کہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ ..... کہ صرف اہلِ ایمان آپس میں بھائی بھائی ہیں ۔ میرا خیال ہے کہ اسی بنا پہ اس مذاکرے کا عنوان اتحاد بین المسلمین رکھا گیا ہے۔ اتحاد بین المسلمین یا اتحاد بین المسلمین و الکافرین نہیں رکھا گیا۔ اس کی وجہ اس کے بغیر کیا ہو سکتی ہے کہ باقی دونوں صورتیں ممکن ہی نہیں۔ لہٰذا اس اتحاد کی ضرورت ہے جس کی بنیاد صرف ایمان ہو۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا اتحاد فی نفسہٖ مقصد ہے یا کسی اور مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے؟ اگر اتحاد ایسی بابرکت شے ہے کہ وہ فی نفسہٖ مقصد ہے تو چوروں کا اتحاد، ڈکوؤں کا اتحاد جرائم پیشہ لوگوں کا اتحاد بھی معاشرے کے لیے بابرکت اور اللہ کی بہت بڑی نعمت ہونا

چاہیئے۔ مگر ایسا کہنے کے لیے کوئی باہوش انسان تیار نہ ہوگا۔ تو پھر اتحاد کی وہ کونسی قسم ہے جو بابرکت بھی ہے اور اللہ کی نعمت بھی ہے اور وہ مقصد کونسا ہے جس کے لیے اتحاد ایک ذریعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی نشاندہی کرتے ہوئے ایک نے کہا ہے۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

اس سے ایک حقیقت کا سُراغ ملتا ہے کہ جب تک "حرم کی پاسبانی" مقصدِ حیات نہیں بنے گا مسلمانوں میں اتحاد ہو ہی نہیں سکتا۔ اور جب حالت یہ ہے کہ وہ قوم جو اپنے رب سے چلّا چلّا کر یہ عہد کر چکی کہ پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ — وہ چالیس برس گذر جانے کے باوجود اس رُخ پہ اٹھنے کی جگہ لا الٰہ الا اللہ کے رستے میں خود پہاڑ بن کر کھڑی ہو گئی ہے یقین نہ آئے تو شریعت بل کی سربازار رسوائی کی تاریخ کا مطالعہ کر لو — جب "حرم کی پاسبانی" کے سلسلے میں مسلمانوں کا یہ رویہ ہے تو ان میں اتحاد کیسے پیدا ہو — شرط اور جزا آپس میں لازم و ملزوم ہوا کرتے ہیں۔

دوسری وجہ عدمِ اتحاد کی یہ ہے کہ اتحاد بین المسلمین پیشِ نظر ہی نہیں بلکہ اتحاد بین المسلمین والکافرین درکار ہے محض ایکٹنگ کے لیے نام اتحاد بین المسلمین رکھ دیا گیا ہے کہ جس کا نام مسلمانوں جیسا ہو وہ مسلمان ہے۔ حالانکہ مسلمان تو موصوف ہے جس کے لیے صفت اسلام لازمی ہے۔ اور اسلام کیا ہے؟ اس کے دو حصے ہیں۔ اوّل عقائد۔ دوم اعمال عقائد میں صرف وہ فہرست شامل ہے جو داعی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے دی۔ ان میں اتحاد شرطِ اوّل ہے۔ مثلاً اسلام کے دائرہ میں لانے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جو اقدام فرمایا کرتے تھے وہ ہے کلمہ کی تلقین جس نے اس پہ یقین کر لیا اور اقرار کر لیا وہ اسلام کے دائرے میں آ گیا۔ مگر اب مطالبہ یہ ہے جو لوگ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس بنیادی اقدام سے شدید اختلاف کرتے ہوئے اپنا کلمہ بھی نیا ایجاد کر چکے ان کے ساتھ بھی اتحاد کرو اور اسے اتحاد بین المسلمین سمجھو۔ یہ دین کے ساتھ مذاق اللہ و رسول کی توہین نہیں تو اور کیا ہے۔

پھر عقائد میں سرفہرست اللہ کی کتاب ہے۔ اسی کی تعلیمات کے مطابق توحید رسالت آخرت کے عقائد اپنانے سے انسان اس اسلام میں ترقی کرتا جاتا ہے جو لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھ کر اس نے قبول کیا تھا۔ اور جہاں عقیدہ یہ ہے کہ اللہ کی وہ کتاب جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی، کسی انسان نے دیکھی ہی نہیں۔ اور یہ کتاب جو مسلمان سینے سے لگائے بیٹھے ہیں، یہ جعلی اور انسانوں کی ایجاد کردہ ہے۔ ان کے ساتھ اتحاد بین المسلمین کہیں گے۔ یہ تو نری ایکٹنگ اتحاد کی، نہ کوشش ہے نہ اتحاد مقصد ہے۔

اس سلسلے میں اتحاد کی جو صورت ہے وہ خالق نے خود بتا دی کہ:

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا یَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا .... یعنی اے اہل ایمان! مشرک نجس ہیں انہیں مسجد حرام کے قریب بھی نہ آنے دو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓی اَوْلِیَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَیْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ۔

یعنی اے اہل ایمان! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست مت سمجھو۔ تم ان کی طرف محبت کا ہاتھ بڑھاتے ہو۔ حالانکہ یہ وہ لوگ ہیں جو اس کتاب کا انکار کر بیٹھے جو تمہارے پاس اللہ کی طرف سے حق کے ساتھ پہنچی ہے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا تو اتحاد سے خود روک رہا ہے۔ ہاں واقعی! مگر وہ اتحاد بین المسلمین سے نہیں روک رہا بلکہ اتحاد بین المسلمین والکافرین سے بچنے کا حکم دے رہا ہے۔ اس کی حقیقت یوں سمجھئے کہ اگر کسی کے پیارے بچے کو ٹی۔ بی ہو جائے تو ڈاکٹر ہدایت کرتا ہے کہ اسے پیار کرنے چومنے اور اس کے سامنے بیٹھنے سے پرہیز کرو۔ کیونکہ اس کے سانس لینے سے ٹی۔ بی جراثیم تمہیں بھی پہنچ جائیں گے۔ اب بتایئے کیا آپ ڈاکٹر کو محبت و اتحاد کا دشمن قرار دیں گے۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ ڈاکٹر کو اپنا حقیقی خیر خواہ

سمجھیں گے تو یہاں یہ اصول کیوں بھلا دیا جاتا ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ کو ڈاکٹر سے بھی ماہر فن میں کم سمجھتے ہو۔

کون بتائے کہ جسمانی ٹی بی کا اثر زیادہ سے زیادہ موت تک ہے مگر عقائد کی ٹی بی تو قبر میں برزخ میں قیامت میں کہیں بھی آرام نہ لینے دے گی۔ پھر جب تمہیں اس ٹی بی سے بچنے کے لیے کہا جاتا ہے تو تم صرف ایکٹنگ کرتے ہوئے طرح طرح کے روپ دھارتے ہو۔ جہاں تک اتحاد بین المسلمین کا تعلق ہے اس کا فقدان محض غلط فہمی کی بناء پر ہے ــــ اس کی حقیقت یوں سمجھیے کہ مسلمانوں میں عقائد کے سلسلے میں توحید، رسالت آخرت، قرآن ملائکہ وغیرہ کے سلسلے میں کوئی اختلاف نہیں اعمال میں جو ارکان اسلام میں نماز، روزہ حج اور زکوٰۃ اور کلمہ میں کوئی اختلاف نہیں۔ اعمال کی بعض صورتوں میں جو اختلاف نظر آتا ہے اسے کم فہمی کی بناء پر مابہ النزاع بنالیا گیا ہے ورنہ اس کی حقیقت یوں سمجھئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت مسلمانوں کے لیے ایک دلربا محبوب کی ہے۔ ہر چاہنے والا اپنی افتاد طبع کے مطابق محبوب کی اداؤں پہ سر دھنتا ہے۔ کسی کو کوئی ادا پسند ہے کسی کو دوسری ہیں سب محبوب کی ادائیں۔ ہر ادا محبوب ــــ فرق صرف اتنا ہے کہ کوئی ادا محبوب تر ہے وہی اپنا رکھی ہے مسلمانوں میں مقلد غیر مقلد اہل حدیث دیوبندی، بریلوی میں جو اختلاف نظر آتا ہے وہ اسی قبیل کا ہے۔ اس لیے یہاں اتحاد بین المسلمین کا اطلاق بھی صحیح ہوتا ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ اصولوں میں جب باہم متفق ہیں تو محبوب کی مختلف ادائیں اپناتے ہوئے بھی باہم اتحاد سے رہ سکتے ہیں۔ اور

جس طرح ہر انسان کا پیدائشی حق ہے کہ متعدی امراض سے اپنے آپ کو بچائے، اسی طرح ہر مسلمانوں کا پیدائشی حق ہے کہ قرآن وسنت کا انکار کرنے والوں سے اپنے آپ کو بچائے رکھیں۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

سوال :۔ آپ کا سوال دو اجزا پر مشتمل ہے یعنی ایسی شخصیت جس سے آپ بے حد متاثر ہوئے ہوں۔ اور دوسرا جزو جس نے آپ کی زندگی پہ گہرا اثر ڈالا ہو۔ جہاں تک پہلے جزو کا تعلق ہے کسی شخصیت سے متاثر ہونا کئی وجوہ سے ہوتا ہے اول یہ کہ اس شخصیت میں کوئی ایسی خوبی نظر آئے یا ایسا کمال دکھائے جسے انسان اپنے لیے ناممکن سمجھتا ہو اور کسی دوسرے انسان میں نہ پایا جائے۔ اس کی وجہ بھی انسان کا اپنا مذاق اور اس خاص خوبی سے لگاؤ ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی مفکر نہایت باریک علمی نکات بیان کرتا ہے کوئی شاعر نہایت بلند تخیل کے حامل شعر کہتا ہے تو کرکٹ کے کھلاڑی کو ان میں سے کوئی چیز بے حد تو کیا ذرا بھی متاثر نہیں کرے گی مگر ایک کھلاڑی کو زندگی کے سنجیدہ حقائق کا متاثر نہ کرنا ان کے کمال کی نفی نہیں ہو گی اس لیے متاثر ہونے کے لیے ضروری ہے کہ انسان کو ذہنی قلبی اور عقلی فریکوئنسی صاحب کمال کی خوبی کی فریکوئنسی کے کہیں قریب ہو۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ہر انسان میں مختلف قسم کی استعداد پائی جاتی ہے گو کوئی ایک پہلو غالب ہوتا ہے اس لیے اس کے مزاج، مذاق اور استعداد کے مطابق جہاں کوئی خوبی نظر آتی ہے وہ متاثر ہوتا ہے مثلاً ایک شخص شعر کا ذوق بھی رکھتا ہے کچھ علمی تحقیق کا مادہ بھی ہے موسیقی سے بھی لگاؤ ہے، کھیل کا شوق بھی ہے، آرٹ سے بھی مانوس ہے تو ظاہر ہے کہ ایک قادر الکلام شاعر بھی اسے متاثر کرے گا اچھے اور کسی اعلیٰ علمی محقق کی تخلیق بھی اسے متاثر کرے گی کسی اچھے راگ سے وہ پھڑک اٹھے گا۔ اچھے کھلاڑی کے کھیل سے اس لیے خوشی ہو گی اور کسی آرٹسٹ کے فن پارہ سے بھی اثر قبول کرے گا۔ مگر یہ ساری اثر اندازی اور اثر پذیری جزوی وقتی اور عارضی چیز ہوتی ہے جو پانی کی سطح پہ ابھرنے والی لہر کی طرح ہوتی ہے ابھی ابھری ابھی غائب۔

(لہذا بے حد متاثر ہونے کے لیے ایسی باکمال شخصیت چاہیئے جو زندگی کے حقائق سے کما حقہ، آشنا ہو اور زندگی کی اقدار عالیہ کی حامل ہو۔ اس کا کمال اس کی اپنی ذات کی حد تک نہ ہو بلکہ متعدی بہ غیر ہو یعنی دوسروں کو بھی باکمال بنانے کا سلیقہ اور فن آتا ہو۔ اور کسی جزوی کمال کا حامل نہ ہو بلکہ زندگی کے تمام پہلوؤں میں کمال حاصل ہو۔ اور

وہ کمال محض خیالی اور تصوراتی دنیائے متعلق نہ ہو بلکہ علمی دنیا میں انفرادی حیثیت سے اور اجتماعی نقطۂ نظر سے انسان کی حقیقی ضرورت سے متعلق ہو۔ کوئی ایسی ہمہ پہلو باکمال کا شخصیت ہو تو "بے حد" متاثر کر سکتی ہے مگر مشکل یہ ہے کہ

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر — کز دیو و دد ملولم و انسانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما — گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

ترجمہ:۔کل ایک بزرگ چراغ لے کر شہر میں گھوم رہے تھے کہ میں درندوں اور بھوتوں سے تنگ آ گیا ہوں انسان کی تلاش میں ہوں میں نے کہا ہم نے اس کی بہت تلاش کی انسان کہیں نہیں ملتا وہ جو نہیں ملتا میں اُسی کی تلاش میں ہوں۔

(جہاں ایسی شخصیت کا ملنا مشکل ہے وہاں ڈھونڈنے والے ملنے بھی مشکل ہیں) مگر کوئی ڈھونڈ سے بھی تو ایسی نگاہ کہاں سے لائے جو ایسی مثالی شخصیت کو پہچان سکے اس کی خوبیوں اور اس کے کمالات کی معرفت حاصل کر سکے۔ میں بھی اس تلاش میں نکلا۔ اور وہ یوں کہ:۔

ع: جستجو کل کی لیے پھرتی ہے اجزا میں مجھے

اہل نظر کے ہاں سے اصول یہ معلوم ہوا کہ کسی سے متاثر ہونے کی تین ممکن صورتیں ہیں۔ جمال، کمال اور نوال پھر جمال سے متاثر ہونے والے دو قسم کے لوگ ہو سکتے ہیں، ایک ظاہر پرست دوسرے حقیقت شناس پہلی قسم کے لوگ جسم کی ڈیل ڈول، رنگ روپ اور اعضاء کے تناسب سے متاثر ہوتے ہیں، دوسری قسم کے آدمی حسن سیرت سے متاثر ہوتے ہیں۔ تیسری قسم ان دونوں کے بین بین ہوتی ہے جو کہا کرتے ہیں

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا ایں دولت از گفتار خیزد

لیکن محض باتوں سے کسی کا دل موہ لینا ایک وقتی تاثر ہوتا ہے اسی لیے تو اہل نظر کہہ گئے ہیں۔

مدحت گفتار کو سمجھو نہ اخلاقی سند
خوب کہنا اور ہے۔ اور خوب ہونا اور ہے

گویا حقیقی طور پر بے حد متاثر وہی شخصیت کر سکتی ہے جس میں جمال ظاہری بھی ہو اور جمال باطنی بھی اور مدحت گفتار بھی ہو اور حسن کردار بھی ہو۔

کمال کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ کمال علمی، کمال فنی، کمال عقلی، کمال ادبی، انتظامی قابلیت حسن معاملہ، عمدہ برتاؤ غرض کوئی کہاں تک شمار کرے۔ جزوی کمال تو مل جاتا ہے مگر اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ کئی میں ایک پہلو کا کمال ہے تو دوسرا پہلو ایسا مایوس کن ہوتا ہے کہ وہ کشش اور جاذبیت صرف جاتی ہی نہیں بلکہ نفرت سے بدل جاتی ہے اور آدمی کہہ اٹھتا ہے۔

؎ اس کی باتوں سے تو نے سمجھا خضر
اس کے پاؤں کو تو دیکھو کہ کدھر جاتے ہیں

ایسی شخصیت کہاں سے ملے جو ہر پہلو سے صاحب کمال ہو۔

نوال کا معاملہ اور بھی مشکل ہے پھر اس مادہ پرستی، مطلب پرستی اور خود غرضی کے دور میں تو ایسے لوگ عنقا ہو چکے ہیں۔ نوال کا بنیادی اصول یہ ہے کہ دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دے۔ دوسروں کے آرام کا خیال اپنے آرام کی نسبت زیادہ ہو۔ ایسی جامع کمالات شخصیت بھلا کیسے ملے۔ خیر تو ایسی تلاش کے دوران ایک غیبی آواز سنائی دی۔ آواز کی شیرینی تو ان کے جگر ایسی شخصیت کا سراغ مل گیا۔ آواز تھی۔ وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ۔ آواز تھی اس کی جو تمام کمالات کا خالق ہے۔ تمام خوبیوں کا خالق ہے تمام رنگینیوں اور دلربائیوں کا خالق ہے۔ اور کلام میں زور اتنا تاکید اس قدر کہ اس شخصیت کو بھیجا ہم نے۔ اور بتایا رحمۃ اللعالمین پھر اس میں حصر کہ صرف اسی کو رحمۃ للعالمین بنایا۔ مگر کون بتائے کہ رحمت کیا ہوتی ہے۔ اور عالمین کی وسعت کا اندازہ کیا ہے۔ رحمت کی حقیقت ممکن ہے پوری طرح سمجھ میں نہ آئے مگر کچھ تاثر ایک جملے سے مل سکتا ہے

ھو الذی ینزل الغیث من بعد ما قنطوا ویشر رحمتہ۔ یعنی جب مخلوق مایوس ہو جائے تو خالق بارش برساتا ہے اور اپنی رحمت پھیلا دیتا ہے، گویا بارش کا پانی رحمت ہے۔ ذرا رحمت کے عمل اور اثر کا جائزہ لیجئے۔ بارش سے مردہ زمین میں جان

آجاتی ہے۔ سوئی ہوئی قوتیں انگڑائیاں لینے لگتی ہیں چھپی ہوئی صلاحیتیں ظاہر ہونے لگتی ہیں جب کہ رحمت کے پانی کو زمین اپنے سینے میں جذب کر لیتی ہے تو وہ چٹیل زمین رنگینیاں اور بہاریں اگلنے لگتی ہے۔ پھل اور میوے غلہ اور سبزیاں غرض مردہ زمین نہ صرف زندہ ہو جاتی ہے بلکہ زندہ مخلوق کی ہر ضرورت کو پورا کرنے کے لیے حیات آفریں بن جاتی ہے۔

اب ذرا رحمۃ للعالمین پر نگاہ کرو۔ بھیجنے والے نے اسے کب بھیجا۔ جب انسانیت سسکیاں لے رہی تھی۔ آدمیت کا لفظ بے معنی ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کی ساری زمین جانوروں درندوں سانپوں اور بچھوؤں سے پُر تھی اور ان سب نے انسانوں کا روپ دھار رکھا تھا۔ تہذیب و تمدن کا نام نہیں تھا۔ بھائی بھائی کے خون کا پیاسا تھا۔ بیٹا باپ کی جان کا لاگو تھا۔ پتھر کی مورتیوں کو خوش کرنے کے لیے انسانوں کے گلے پر چھری رکھ کر ان کا خون بہایا جاتا تھا۔ شوہر کی وفات پہ بیوی کو زندہ ہی جل جانے پہ مجبور کیا جاتا تھا۔ بچیوں کو زندہ درگور کر دیا جاتا تھا۔ خالق رحمت اس نعمت کی یاد یوں دلاتے ہیں۔

واذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ کنتم اعداءً فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا۔

یعنی اللہ کی اس نعمت کو تو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے اللہ نے تمہیں اس نعمت کے ذریعے یوں بدل دیا کہ تم آپس میں بھائی بھائی بن گئے۔ بارش برسانے کے بعد زمین کی حالت میں جو انقلاب آتا ہے اسے لوگ دیکھتے ہیں اور اعتراف بھی کرتے ہیں مگر رحمۃ للعالمین کی بارش برسنے سے انسانیت میں جو انقلاب آیا اس کی طرف بہت کم توجہ ہوتی ہے۔ لو اس انقلاب کو چشم بینائے دیکھنے والوں کی بات سنو وہ کیا کہتے ہیں۔

دُرفشانی نے تری قطروں کو دریا کر دیا
دل کو روشن کر دیا آنکھوں کو بینا کر دیا

خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مُردوں کو مسیحا کر دیا

ہاں عالمین کے مفہوم میں صرف انسان تو نہیں آتے ۔ اس کائنات میں کتنے جہان بکھرے پڑے ہیں عالم جمادات ہے، عالم نباتات ہے عالم حیوانات ہے اور نہ جانے اور کتنے عالم ہیں جو انسان کے مشاہدے یا علم میں ابھی تک نہیں آئے ۔ اس ترکیب کے مفہوم کی تفصیل میں کہاں تک جاؤ گے یہ سلسلہ تو لامتناہی ہے ۔ عالم جمادات میں زمین ہی کو دیکھو رحمۃ للعالمین نے عالم جمادات کے لیے رحمت ہونے کی کیسی بشارت سنائی کہ جعلت لی الارض مسجدا وطھورًا ۔ یعنی میری آمد کا اثر زمین کے حق میں یہ ہوا کہ خالق نے ساری زمین کو پاک اور سجدہ گاہ بنا دیا ۔ پہلے انسانوں کو عبادت کے لیے زمین پہ کوئی جگہ مخصوص کر لینا پڑتی تھی ۔ اس کے بغیر کسی جگہ عبادت نہیں ہو سکتی تھی مگر اب یہ حال ہے کہ :۔

ع ہر جا کنیم سجدہ بآں آستاں رسد

بشرطیکہ انسان خود اپنی بدتمیزیوں اور بد اعمالیوں سے زمین کے کسی حصے کو طہارت سے محروم نہ کر دے اور سجدہ گاہ بننے کے لائق نہ رہنے دے ۔

جہاں تک نباتات اور حیوانات کا تعلق ہے رحمۃ للعالمین کے ارشادات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے ۔ کہ گھاس، سبزہ، فصل پھل دار اس کی تفصیل کے لیے تو ایک ی کتاب درکار ہے ۔

جہاں تک عالم انسانیت کا تعلق ہے رحمۃ للعالمینی کو تین مختلف عنوانوں سے واضح کیا گیا ہے۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ
حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ ۔

عالم انسانیت کو خطاب کر کے بھیجنے والے نے فرمایا کہ تم کوئی بیجان پتھر تو نہیں ہو نہ بے شعور حیوان بلکہ کامل عقل و شعور احساس و ادراک والے انسان ہو تو ہم نے سب سے پہلے یہ اہتمام کر رحمتِ عالم کو تمہاری جنس میں سے انتخاب کر کے مبعوث کیا کہ تمہاری بہانہ جو عقل کہیں یہ نہ کہہ دے کہ صحبت ناجنس سے کیا حاصل یا تم اجنبیت محسوس

کرنے لگو تو ہم نے اس رحمت سے کما حقہ فائدہ اٹھانے کے لیے تمہاری جنس ہی سے پیدا کیا۔

اس رحمت عالم کا تمہارے ساتھ برتاؤ یہ ہے کہ چوٹ تمہیں لگے درد اسے ہوتا ہے۔ تکلیف تمہیں پہنچے دکھ اُسے ہوتا ہے۔ غرض وہ ہر وقت اسی فکر میں رہتا ہے کہ تمہیں کوئی آزار نہ پہنچنے پائے اور اس کی نگاہ اتنی دُور رس ہے کہ وہ تمہیں صرف اس تکلیف ہی سے نہیں بچانا چاہتا جو تمہیں اس چند روزہ زندگی میں پہنچ سکتی ہے بلکہ وہ تو اس فکر میں گھلتا ہے کہ ابدی زندگی میں تم ہر تکلیف سے محفوظ رہو اور اس کے اس کڑھنے رہنے کی شہادت خود اس کے بھیجنے والا دیتا ہے۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ اور یہ تو خود تمہاری ذات سے بھی زیادہ تمہارا خیر خواہ ہے چنانچہ اس نے ایک مثال سے اس کی وضاحت کی چشم تصور کے سامنے یہ منظر لاؤ کہ گھپ اندھیری رات ہے سنسان جنگل ہے ایک شخص آگ جلاتا ہے۔ پروانے ہر طرف سے اڑ کر آتے ہیں۔ اس آگ میں کودتے ہیں وہ شخص آگ کے کنارے کھڑا دونوں بازو پھیلائے پروانوں کو آگ میں جلنے سے روکتا ہے۔ مگر وہ ہیں کہ باز نہیں آتے۔ یہی مثال میری اور تمہاری ہے میں تمہیں جہنم کی آگ سے بچانے کی کوشش کر رہا ہوں اور تم ہو کہ بگٹٹ گھوڑے کی طرح جہنم کی طرف دوڑے جا رہے ہو۔

تیسرا عنوان یہ بیان کیا کہ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ یعنی اس کی انتہائی خواہش اور انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ہر خوبی تمہارے حصے میں آئے اور ہر کمال تمہیں حاصل ہو۔

پھر خالق نے عالم انسانیت میں سے ایک مخصوص جماعت کو الگ کر کے ان کے ساتھ رحمۃ للعالمینی کا خصوصی برتاؤ بیان فرمایا کہ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۔ یعنی جن نگاہوں نے اسے پہچان لیا ہے۔ جو دل اس کی محبت میں سرشار ہیں جن لوگوں کو اس کی صداقت اور خیر خواہی کا یقین ہو چکا ہے۔ جو لوگ اس کے ساتھ پیمان وفا باندھ چکے ہیں ان کے لیے وہ صرف رحمت ہی نہیں رافت مجسم ہے۔ ہر وصف کے مختلف درجے ہوتے ہیں اور ہر درجے میں وہ وصف وصف ہی رہتا ہے مگر ہر وصف کا ایک

انتہائی اعلیٰ درجہ ہوتا ہے۔ بلندی کی معراج ہوتی ہے اس سے آگے اس وصف کا کوئی درجہ نہیں ہوتا تو رافت بھی رحمت کے انتہائی بلند درجے کا نام ہے اہلِ زبان کہتے ہیں۔ رافہ رحمہ اشد رحمتہ۔ یعنی رحمتہ للعالمین کا جنس انسان میں سے اس گروہ کے ساتھ جو اس کے بن چکے ہیں رحمت کے اس درجے کا سلوک ہے کہ اس سے آگے رحمت کی کسی صورت کا تصور بھی نہیں کیا جاتا۔

رحمتہ للعالمین کے دیکھنے والوں کا بیان سُنا کہ

واحسن منک لم تر قط عینی ــــ واجمل منک لم تلد النساء

خلقت مبرءً من کل عیب ــــ کانک قد خلقت کما تشاء

اس کے جمال معنوی کی عظمت خود اس کے خالق کی زبانی سنی کہ انک لعلیٰ خُلقٍ عَظِیم اس کے کمال کا سلسلہ اتنا پھیلا اور پھیلتا جا رہا ہے کہ دوستوں نے تو کیا دشمنوں نے بھی اعتراف کیا ہے انہوں نے تو کیا غیروں نے بھی گن گائے ہیں۔ ایک دشمن نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ:

"عرب کے بانجھ اور بنجر زمین دیکھتے ہی دیکھتے نابغہ روزگار اور عبقری قسم کے رہنماؤں کی نرسری بن گئی جن کی مثال تاریخ انسانی میں اور سفید فام اقوام میں کہیں نہیں ملتی"۔ (فلپ کے حتّٰی) دافعی الفضل ما شہادت بہ الاعداء۔ یعنی عظمت اور کمال وہ ہے جس کا اعتراف کرنے پر دشمن بھی مجبور ہوں۔ اور یہ مجبوری کسی خارجی دباؤ کا نتیجہ نہ ہو بلکہ ان کے ضمیر کی آواز ہو۔

اس کے نوال کا کیا کہنا جو انسانیت کی بہتری کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر کے دن رات کو شاں ہوا اعلان کئے جا رہا ہے کہ ما اسئلکم علیہ من اجر کہ میں تمہاری اس خیر خواہی اور اس ساری جد و جہد کے لیے تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتا۔ اور جب وہ ایسے حالات پیدا کر لے کہ دُنیا کی دولت سمٹ کے اس کے قدموں میں آجائے تو اس کا منظر یہ ہو کہ

ہے قدموں میں ڈھیر اشرفیوں کا لگا ہوا ــــ اور تین دن سے پیٹ پہ پتھر بندھا ہوا
اوروں کے واسطے ہے زر و مال اور گہر ــــ اپنا یہ حال ہے کہ ہے چولھا بجھا ہوا

بنانے والے سے دیکھنے والوں سے رفقاء سے اغیار سے اس کے جمال، کمال اور

نوال کی تفصیل سن کر یقین کیونکر نہ آتا، اس کے لیے محبت کے جذبات کیسے نہ اُبھرتے مگر لوگ کہتے ہیں۔

ع شنیدہ کے بود مانند دیدہ

تو جب خود ذاتی طور پر نظارہ جمال کی سعادت نصیب ہوئی تو یوں محسوس ہوا کہ جیسے کہنے والے نے اسی حقیقت کی تصویر الفاظ میں کھینچی تھی کہ

ے زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

اور غالب کے ہمنوا ہو کہ بے اختیار کہہ اٹھا

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

سو میرے عزیز مجھے تو اسی شخصیت نے زندگی میں بے حد متاثر کیا۔ اور زندگی پر جو اثر چھوڑا اسے کیونکہ بیان کروں:

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ کسی شخصیت کا بے حد متاثر کرنا اس امر کا متقاضی ہے کہ وہ شخصیت محبوب بن جائے۔ اور خالق نے اس شخصیت کو محبوب بنانا مطلوب و مقصودِ مومن قرار دیا ہے اور اسی کی زبان سے اعلان کرایا ہے کہ قل ان کان اٰباؤکم و ابناؤکم و اخوانکم و ازواجکم و عشیرتکم و اموال نہ اقترفتموھا و تجارۃ تخشون کسادھا و مساکن ترضونھا احب الیکم من اللہ و رسولہ و جھادٍ فی سبیلہ فتربصوا حتیٰ یاتی اللہ بامرہٖ

"یعنی اے میرے حبیب! یہ اعلان کر دیجئے کہ مجھ سے پیمانِ وفا باندھنے والو کان کھول کے سن لو اگر تمہارے باپ یا بیٹے یا بھائی یا بیویاں یا رشتہ یا تمہارے مال یا تمہارا شغل تجارت یا تمہارے پسندیدہ مکان اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جدوجہد کرنے کے مقابلے میں زیادہ محبوب ہیں تو اس کی گرفت کا انتظار کرو۔"

اور ظاہر ہے کہ ایسی مجموعہ کمالات ہستی تو واقعی اس قابل ہے کہ اس کی محبت کا

دعویٰ کرنے والے کی نگاہ میں ہر مرغوب چیز پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہ رکھے۔
پھر اس محبوب نے بڑے اختصار سے یہی حقیقت اپنے الفاظ میں یوں بیان فرمادی کہ،
لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین۔
"یعنی تم میں سے کوئی شخص صحیح معنوں میں میرا نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنے باپ اپنے بیٹے اور دنیا کے ہر محبوب انسان کے مقابلے مجھے زیادہ محبوب نہ سمجھے۔"
تو پہلا اثر جو ہوا اس کو میر تقی میرؔ کی زبان میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

ے عشق و محبت کیا جانوں ہوں پر اتنا میں جانوں ہوں
اندر ہی اندر بیٹھے ہوئے میرے کو کوئی ملتا ہے

اور شیفتہ کی زبان میں ہی کہا جا سکتا ہے۔

ے شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

اور یہ چیز ایسی قیمتی ہے کہ اہلِ دل کہہ گئے ہیں۔

ع یک ذرہ دردِ دل از علم فلاطوں بہ

دوسری بات یہ ہے کہ یہ محبت کچھ تقاضے بھی سامنے لاتی ہے اور اس کے لیے کچھ پیمانے بھی ہیں کیونکہ محبت کوئی مادی چیز نہیں کہ مشاہدہ کیا جا سکے اس لیے آدمی اس معاملے میں خود فریبی کا شکار بھی ہو سکتا ہے تو محبوب نے اپنی محبت کا معیار اس کا پیمانہ اور دعویٰ محبت کی صداقت کی دلیل خود بتادی کہ من احب سنتی فقد احبنی ومن احبنی کان معی فی الجنۃ یعنی جو شخص میری محبت کا مدعی ہے اسے یہ دیکھ لینا چاہیئے کہ اگر اس کی عملی زندگی کا نقشہ میرے بتائے اور میرے سکھائے ہوئے اور میرے اختیار کئے ہوئے طریقے کے مطابق ہے تو محبت کے دعوے میں سچا ہے ورنہ بہروپیا ہے اور جو اس معیار پر پورا اترا اسے خوش ہونا چاہیئے کہ ابدی زندگی میں اسے میری معیت حاصل ہوگی۔ اور وہاں محبوب سے جدائی کا کوئی کھٹکا نہ ہوگا۔
تو دوسرا اثر یہ چھوڑا کہ سنت نبوی کی حیثیت، اہمیت، عظمت اور حقیقی افادیت

کا احساس پیدا ہو گیا۔

تیسری بات یہ ہے کہ سنت نبوی کی ترکیب ایسا اجمال ہے جو اس قسم کی تفصیل کا متقاضی ہے کہ عملی زندگی کے سارے پہلو اس کی لپیٹ میں آجائیں اس کے دو حصے بنتے ہیں ایک نظری یا ایمانی دوسرا عملی پہلے حصے میں سنت نبوی کی رہنمائی اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ اول اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ کھرا ہو۔ دوسرا یہ کہ محسن انسانیت، محبوب حقیقی صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات کا احساس ہو اور محبوب سے پیمان وفا نبھانے کا پختہ عزم ہو شوق ہو تڑپ ہو جذبہ ہو تیسرا یہ کہ آخرت کی جوابدہی کا یقین ایسا ہو کہ عملی زندگی میں جو کچھ کیا جائے آخرت کی جوابدہی کے تصور کے ساتھ کیا جائے۔

چوتھا یہ کہ منظر یہ اور عمل میں صحیح توازن ہو وہ یوں کہ دنیا اور سامان دنیا اور آخرت کی کامیابی مقصد۔ لہٰذا نہ اس ذریعہ کے کی بے قدری کی جائے۔ نہ ذریعے کو مقصد بنا لیا جائے نہ مقصد کو ذہن سے دور ہونے دیا جائے۔

پانچویں بات یہ مخلوق کے سامنے معاملہ کرنے میں یہ اصول اختیار کیا جائے کہ خود غرضی اور مطلب پرستی سے احتراز اور باہمی معاملات میں ایثار کی روش اختیار کی جائے۔ ایک طرف یہ تعلیم دی کہ الدین النصیحۃ یعنی دین نام ہی دوسروں کی خیر خواہی کا ہے۔ اور دین کی حقیقت رحمۃ للعالمین کی محبت کے سوا کچھ نہیں یعنی اس محبت کا ایک ثبوت دوسروں کی خیر خواہی کا جذبہ پیدا کرنا ہے۔ دوسری طرف یہ تعلیم المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ یعنی میرا جانے والا وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسروں کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ گویا معاشرتی زندگی کے لیے مثبت اور منفی سلبی اور ایجابی دونوں واضح کر دے۔

چھٹی بات یہ ہے کہ پوری زندگی اور زندگی کے ہر شعبے میں عمل کی بنیاد اخلاص اور خلوص نیت پہ ہو۔ تصنع، بناوٹ، شہرت ناموری یا واہ کے لیے کوئی کام نہ ہو اور یہی بات آج کے معاشرے میں سب سے مشکل ہے۔ مغربی تہذیب نے تاکید کی ہے کہ کسی کام میں شو میں فرق نہ آنے پائے۔ اور محبوب کی تعلیم یہ ہے کہ کسی کام میں دکھاوے کا تصور بھی ذہن میں نہ آنے پائے۔ فسون مغرب کا یہ اثر ہے کہ آج عبادت

میں شو، نمائش، جھنڈے، نعرے، جلوس، چراغاں ایک ضرورت کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔ اور خود نمائی کا جذبہ یہاں تک پہنچ چکا ہے کہ بندے کو اپنے رب سے جو چیز نہایت عاجزی سے خشوع وخضوع سے رازداری سے مانگنی چاہیئے وہ دھوم دھڑکے سے سے مالکونس، کدارا یا بھیروں کی طرز سے مانگی جاتی ہے اور نقشہ کچھ یوں بن گیا ہے کہ۔

انہیں شوق عبادت بھی ہے اور گانے کی عادت بھی
نکلتی ہیں دعائیں ان کے منہ سے ٹھمریاں بن کر

عملی زندگی میں دورنگی کچھ اس طرح نفوذ کر گئی ہے کہ ہر جگہ تضاد ہی تضاد نظر آتا ہے۔

مغربی شوق بھی ہے وضع کی پابندی بھی
اونٹ پہ چڑھ کے تھیٹر کو چلے ہیں حضرت

سو میرے عزیزیہ ہے وہ شخصیت۔ اور یہ ہے اس کے کمال کی شان اور یہ ہیں وہ اثرات جو اس نے انسانیت کے لوح دل پہ چھوڑے ہیں۔

ہر دور کا انسان بالعموم اور آج کا انسان بالخصوص ایک آئیڈیل کی تلاش میں ہے۔ مگر بے ذوقی یا کور ذوقی کا یہ عالم ہے، کہ اس مقصود کائنات مطلوب کائنات اور محبوب کائنات کی معرفت کا شعور حاصل نہیں ہوتا۔ اور ترجمان حقیقت کو اس قوم کے متعلق یہ کہنا پڑا۔

ع:۔ دے دارند و محبوبے ندارند

بس اتنا کہہ سکتا ہوں۔

ایں قلب فرسودہ گراز کوئے تو دور است
اُنقَلِّبُ عَلٰی بَابِکَ لَیلاً و نَہَاراً

اَللّٰھُمَّ صلی علیٰ سیّدنا محمدن النبی الامی وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ وبارک وسلم